

کُن ..... ہو

فیکون ..... ہو گیا

پوری کائنات کا مرکز کن فیکون ہے۔ اور اس "ہو" سے ہو جانے تک انبیاء و اولیاء سبھی شامل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر دور کے انسان کو کن اور فیکون کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اس کرۂ ارض پر عورت کی اہمیت و افادیت کو باوجود کوشش کے کبھی بھی ختم نہیں کیا جاسکا۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات نے عورت کو کبھی عروج بخشا ہے اور کبھی ذلت و رسوائی کے گڑھوں میں دھکیل دیا ہے۔ عورت خواہ ہزاروں سال قبل کے معاشرہ کی ہو یا آج کے انتہائی ترقی یافتہ دور کی۔ وہ ایک ماں ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسمیں کبھی تغیر نہیں ہوا ـــــ اس کے باوجود معاشرہ میں خواہ وہ ماضی کا ہو یا حال کا عورت کو ہمیشہ ہدف تنقید بنایا گیا اور اس کی خدا داد صلاحیتوں پر قدغن لگانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اس طرز عمل کو مرد کی فطری کمزوری کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں، یہ کرۂ ارض کا انتہائی ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے اس دور میں انسان نے چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈالدی ہیں۔ عورت بھی مرد کے شانہ

سے شانہ ملا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

عورت نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ "صنف نازک" ہونے کے باوجود اس کی صلاحیتیں مرد سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

تصوف کی دنیا میں بھی عورت نے بھرپور حصہ لیا۔ اور بعض دفعہ وہ مردوں سے بھی آگے نکل گئی۔ لیکن مرد کی انا پرستی نے ایسی خواتین کو کبھی کوئی مقام نہیں دیا۔

"ھستافنے" ایک ایسی ہی خاتون کی کہانی ہے اس کہانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماضی کی طرح آج کے دور میں بھی عورت عرفان و آگہی کی منزلیں طے کر سکتی ہے اس کہانی میں تصوف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے سبق بھی ہے اور عبرت بھی۔ جو لوگ خواہش نفس کے آگے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

اس کہانی میں سکھ دیو بھی ہے۔ جو اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ روحانیت کسی کی میراث نہیں بلکہ ہر مکتبۂ فکر کے لوگ اس موجزن دریا سے فیضیاب ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اگر یہ کہانی آپ کو پسند آئی ہے اور اس نے آپ کو متاثر کیا ہے تو میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ شکرگزار ہوں کہ روحانی ڈائجسٹ کے مدیر جناب حکیم وقار یوسف عظیمی نے ہر ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی۔ اگر میں اس بات کا برملا اظہار نہ کروں کہ کہانی میں حقیقت کا رنگ ـــــ روحانی ڈائجسٹ کے روحانی ماحول کا مرہون منت ہے۔

محمد یونس خان عظیمی

فہرست

میری اس داستان کا آغاز قیام پاکستان کے فوراً بعد سے ہوتا ہے۔

اس داستان کے شروع کا حصہ میری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ جب میں شعور کی منزل پر پہنچا تو حسب روایت اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں میں صبح ہی صبح ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد پہنچ جاتا۔ اسکول سے واپسی کے وقت اکثر میں سڑک کے کنارے دیکھا کرتا کہ شعبدہ باز مداری مجمع لگایا کرتا تھا۔ اپنے چست فقروں سے لوگوں کو ہنساتا اور ایسے کمالات بھی دکھاتا کہ لوگ حیرت زدہ ہو جاتے۔ میں ہر روز اسکول سے واپسی پر کسی نہ کسی مجمع میں بحیثیت تماشائی کے شامل ہو جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے ان کمالات کے سیکھنے کا شوق ہوا۔ دراصل میں سمجھتا تھا یہ جنات کا کام ہے۔ اور یہ آدمی جو کمالات دکھاتا ہے اس کے پاس کوئی جن ہے جس سے یہ کام لیتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں بھی کسی جن کو میں بھی تابع کر لوں اور اس سے کام لے کر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو متحیر کر دوں۔

ایک دن مجمع ختم ہونے کے بعد میں نے اپنی خواہش کا اظہار ایک شعبدہ باز سے کیا تو وہ میری بات سن کر زور سے ہنسا اور اس نے مجھے یہ سمجھا بجھا کر مایوس کر دیا کہ میں ابھی بہت چھوٹا ہوں، مجھے تعلیم حاصل کرنا چاہیے

جب میں نے بہت زیادہ ضد کی اور اس نے بھی یہ دیکھا کہ یہ ہر روز مجمع میں

آتا ہے تو ایک دن مجمع ہی میں اس نے دھاگے کو توڑا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ٹوٹا ہوا دھاگہ ثابت تھا۔ وہ یہ شعبدہ یوں تو ہر روز ہی دکھایا کرتا تھا لیکن اس روز اس نے یہی شعبدہ دو تین بار دکھایا اور ساتھ ہی مجمع کو اس کا طریقۂ کار بھی سمجھایا۔

دراصل ہم کو تو یہ نظر آتا تھا کہ اس نے دھاگہ توڑ دیا ہے جب کہ ثابت دھاگہ اس کے ہاتھ ہی میں رہتا تھا۔ صرف دھاگے کا آخری سرا توڑ کر وہ نہایت ہی صفائی سے پھینک دیا کرتا تھا۔ اس کا یہ شعبدہ نہایت حیران کن تھا لیکن جب مجھے اصل حقیقت کا علم ہوا کہ یہ سب "ہاتھ کی صفائی" کا کمال ہے تو حیرت انگیز کمالات کے سیکھنے کا شوق ختم ہو گیا جنات اور پُراسرار واقعات پہ سے یقین بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اب بڑے سے بڑا واقعہ بھی رونما ہو جاتا تو میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

بہرحال، ان باتوں کا مقصد اس سرگزشت کی تمہید ہے تاکہ قارئین کو اصل واقعہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ اب میری نظر میں ہر کمال اور ہر حیرت انگیز" واقعہ محض ہاتھ کی صفائی تھا، یا یوں سمجھ لیجئے کہ اب میں نیم پختہ "مادہ پرست" تھا۔

اصل واقعہ یوں ہے —

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے خاندان کے بیشتر افراد نے اندرونِ سندھ رہائش اختیار کر لی اور فکرِ معاش میں مصروف ہو گئے۔

رانی میری خالہ زاد بہن تھی۔ حیدرآباد میں خالو کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ مارکیٹ میں ان کی پرچون کی دکان تھی۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ رانی اور اس سے چھوٹا لڑکا شاہد بس دو ان کی اولادیں تھیں۔ میں ان دونوں سے بڑا تھا لیکن اس کے باوجود ہم تینوں آپس میں دوستوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تینوں ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور چھٹیوں کے دنوں میں بھی ہم تینوں ساتھ ہی کھیلا کرتے تھے۔

پھر..... رفتہ رفتہ ..... وقت گزرتا گیا۔ اسکول کا زمانہ ختم ہوا۔ بچپن کے کھیل چھوٹ گئے۔ کھلنڈرے پن کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ رانی اب بھولی بھالی بچی نہیں رہی بلکہ ایک نہایت سنجیدہ لڑکی تھی۔ میں ہفتہ میں چار پانچ دن ضرور ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ خالہ کی شفقت نے مجھے گھر کا فرد بنا دیا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ میں ان سب سے وقتی طور پر جدا ہو گیا۔ ملازمت کے سلسلے میں مجھے میرپور خاص جانا پڑا اور تقریباً تین سال بعد میں واپس حیدرآباد لوٹا۔

واپس آنے کے بعد دو تین دنوں تک دفتر کے کاموں میں ایسا الجھا رہا کہ کسی کو بھی اپنی آمد کی اطلاع نہ دے سکا۔ دفتر کے کام سے کچھ فرصت ملی تو میں نے سب سے پہلے خالہ کے گھر کا رخ کیا۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو ہر شخص نے میرا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ خالہ اور خالو نے ہزاروں دعائیں دیں۔ وہ سب ہی میرے واپس حیدرآباد آجانے پر خوش تھے۔ لیکن رانی — وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے ایک بار موقع پا کر بھرپور نظروں سے اُسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر پہلی جیسی شگفتگی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ ایک لمبے عرصے سے بیمار ہو اور جب میں نے خالہ جان سے اس بارے میں پوچھا تو انھوں نے وہ بات کہی جس پر مجھے ایک طویل عرصہ تک اعتبار نہیں آیا۔

خالہ جان نے نہایت ہی خوف اور پریشانی سے بتایا۔

بیٹا! تمہارے حیدرآباد سے جانے کے بعد ہم نے رانی کی شادی کے بارے میں سوچا۔ رانی کے لیے رشتے تو بہت آئے لیکن تمہارے خالو کی سمجھ میں کوئی بھی نہیں آیا۔ ان رشتوں میں کونے والے بنگلے کے زمیندار کے لڑکے کا رشتہ بھی شامل تھا۔

خالہ کے گھر کے سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک زمیندار کا بڑا سا

بنگلہ نما مکان تھا۔ اس کی سینکڑوں ایکڑ زمین اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ دراصل یہ لوگ دہلی سے تعلق رکھتے تھے اور تقسیم ہند سے چھ سات برس قبل ہی یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے ایک ہی لڑکا تھا چونکہ باپ کاروبار اور زمین کا مالک تھا لہٰذا انہوں نے بیٹے کو تعلیم دلانا فضول سمجھا۔ بیٹا دن بھر دوستوں کے ساتھ گھر یلو کام کرتا رہتا یا پھر کبھی شام کو جیب لے کر شہر میں گھومنے نکل جاتا۔

یوں تو اس میں تمام عادتیں اچھی تھیں۔ بڑے سے گردن جھکا کر ملتا۔ بزرگوں کی عزت کرتا۔ ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتا لیکن اس میں ایک عادت بہت ہی بُری تھی اور وہ تھی نشہ کی عادت۔ گو کہ محلے کے کسی آدمی نے کبھی نشہ کرتے یا نشہ کی حالت میں گھومتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے قریبی دوستوں کا کہنا تھا کہ "اخلاق" میں سورج غروب ہوتے ہی نشے کا دورہ شروع سا ہو جاتا ہے۔

ایک دن شام کو اس کی ماں خالہ کے پاس آئی۔ اس نے جو رانی کو دیکھا تو دل و جان سے اسے اپنی بہو بنانے کی خواہش مند ہو گئی۔ اس نے دل کی بات خالہ سے کہی۔ خالہ نے سُن کر ناک بھنویں چڑھائیں اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی انہیں نہیں دیں گی۔ ان کے خیال میں رانی زمیندار کے گھر میں گزارہ نہیں کر سکتی تھی۔ زمیندار کی بیوی نے انہیں راضی کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن خالہ اس کی کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہیں ہوئیں۔ پھر یہ بات خالو تک پہنچی۔ زمیندار نے خود خالو سے آکر بات کی۔ خالو کچھ کچھ راضی تو ہو گئے لیکن انہیں لڑکے کی نشہ والی عادت کھٹک رہی تھی۔

لڑکے نے خالو کو قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ شادی کے بعد نہ صرف نشہ چھوڑ دیگا بلکہ کسی بھی نشہ آور چیز کے قریب نہیں جائے گا۔ لیکن خالو چاہتے تھے کہ وہ شادی سے پہلے ہی اس بُری عادت کو ترک کر دے۔ لڑکا اس بات کے لیے بھی تیار تھا لیکن خالہ [illegible] کہ یہ رشتہ کسی نہ کسی طرح سے ٹل جائے۔

آخر وہی ہوا۔ جب کسی بھی طرح سے بات نہ بنی تو زمیندار کے گھر والے خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ خالہ اور خالو بھی دوسرے رشتوں کی چھان بین میں مصروف ہو گئے۔

چھ سات ماہ کے بعد، جب سخت گرمیوں کا موسم تھا، ایک سہ پہر کو تمام گھر والے سو کر اُٹھے تو رانی کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چاروں جانب اجنبیوں کی مانند دیکھا۔ خالہ نے اس کی سُرخ آنکھیں دیکھیں تو سمجھیں گرمی کی وجہ سے ہو گئی ہیں۔ وہ بڑے ہی پیار سے بولیں "جا بیٹا! غسل خانہ میں جا کر نہا لے"

رانی نے خالہ کی بات کا جواب دینے کے بجائے پلنگ سے باہر کی جانب چھلانگ لگائی اور صحن میں جا کر کپڑے سکھانے والی رسی کو ہاتھوں سے پکڑ کر بندر کی طرح جھولا جھولنے لگی۔ رانی کی اس غیر متوقع حرکت کو دیکھ کر خالہ کچھ پریشان سی ہوئیں اور صحن میں آکر اُسے ڈانٹا "اری لڑکی! یہ تو کیا کر رہی ہے!"

رانی نے گھور کر ماں کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحوں اپنے دونوں پاؤں رسی میں پھنسا کر الٹا جھولنے لگی۔

یہ دیکھ کر خالہ کے ہوش جاتے رہے۔ وہ فوراً ہی کمرہ میں آئیں اور خالو کو اٹھایا کہ باہر آکر دیکھو بیٹی کیا حرکتیں کر رہی ہے۔ ساتھ ہی شاہد بھی اٹھ گیا۔ تینوں باہر صحن میں آئے تو دیکھا کہ رانی مزے کے ساتھ رسی سے اُلٹی لٹکی جھولا جھول رہی ہے۔

خالو نے اُسے ڈانٹا لیکن رانی نے جیسے سنا ہی نہیں پھر وہ اور شاہد آگے بڑھے۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر رانی نے ایک لمبا سا جھوک لیا اور دوسرے ہی لمحہ دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر لٹک گئی۔ آخر اُسے بڑی مشکل سے پکڑ کر بستر پر لٹایا۔ خالو کا خیال تھا کہ رانی کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے لہٰذا انہوں نے فوراً ہی اپنے بیٹے شاہد کو بھیجا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔

ڈاکٹری علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ رانی کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی

دن میں کئی بار اس پر اس قسم کے دورے پڑنے لگے۔ آخر مجبور ہو کر اسے عاملوں کو دکھانا پڑا۔ اسے جس نے بھی دیکھا یہی کہا کہ کسی نے سخت قسم کا جادو کر دیا ہے۔

بعض عاملوں نے اس کا جادو اتارنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گھر میں جیسے ہی کوئی عامل قدم رکھتا، رانی کو علم ہو جاتا اور وہ نہایت ہی بیہودہ قسم کی گالیاں بکنے لگتی۔ پھر بھی اگر وہ نہیں جاتا تو جو چیز بھی ہاتھ میں آتی پھینک مارتی یا خود ہی اس سے دست و گریبان ہو جاتی۔

رانی کی اس خطرناک حالت سے پورا محلہ واقف تھا۔ چند ہمدرد لوگوں نے خالہ اور خالو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر بزرگوں کے مزارات پر جائیں۔ شاید وہ اس طرح سے ٹھیک ہو جائے۔ خالہ اور خالو رانی کو لے گئے۔ مشہور بزرگوں کے مزارات پر گئے۔ اسے وقتی طور پر فائدہ تو ہو جاتا تھا لیکن گھر آنے کے چند دنوں بعد حالت پھر پہلے جیسی ہی ہو جاتی تھی۔

اور اب وہ تھک ہار کر بیٹھ چکے تھے۔

خالہ جان کی یہ تمام داستان سننے کے بعد میں نے سوچا کہ یہ سب ضعیف الاعتقاد لوگوں کی باتیں ہیں۔ بھلا سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں جادو کا کیا کام! اس قسم کی باتیں بوڑھے لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ میں نے خالو کو مشورہ دیا کہ رانی کو کسی ماہر ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔

"ارے بیٹا!" خالہ جان پان منہ میں رکھ کر بولیں۔

"حیدر آباد اور کراچی کا کون سا ایسا ڈاکٹر ہے جسے ہم نے رانی کو نہیں دکھایا۔ ان سب کا کہنا ہے کہ لڑکی بالکل تندرست ہے۔ اسے کوئی مرض نہیں ہے!"

"پھر۔۔۔؟" اس انکشاف پر میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پھر کیا؟ بڑے بڑے عاملوں کا کہنا ہے کہ تمہاری بیٹی پر "سایہ" ہے" خالہ نے

خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

"لیکن آخر اس کا علاج کیا ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"اللہ کے کلام میں بڑی ہی طاقت ہے بیٹا!" خالہ نے بڑے تحمل سے کہا۔ "اس سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے ایک پیر صاحب نے فلیتے دیے ہیں۔ ان کی دھونی دے رہی ہوں!"

"اللہ شفا دے!" میں نے بات ختم کرنے کی خاطر کہا کیونکہ اب اس معاملہ میں بحث کرنا بے کار تھا۔

پھر میں نے شاہد کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور خالہ کے گھر سے نکل آیا۔

خالہ کے گھر سے نکل کر ہم دونوں ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ درحقیقت میں اس مسئلہ پر شاہد سے مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے میز پر گرم گرم چائے رکھی ہوئی تھی۔

"مجھے بتاؤ، اصل قصہ کیا ہے؟" میں نے سلسلۂ کلام شروع کرنے کی خاطر شاہد سے پوچھا۔

"امی نے تمہیں ساری بات تو بتا دی!" شاہد نے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ ممکن ہے یہ ہسٹریا کے دورے ہوں!" میں نے کہا۔

"شروع میں والد صاحب کا بھی یہی خیال تھا!" شاہد چائے کا گھونٹ لے کر بولا۔ "لیکن ڈاکٹروں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ رانی بالکل تندرست ہے!"

"تو تمہارے خیال میں بھی رانی پر کسی کا "سایہ" ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خیال ہی نہیں، حقیقت یہ ہے!" شاہد نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ ۔۔۔ کیا تم بھی سائنس کے اس جدید دور میں جادو اور روحوں پر اعتبار کرتے ہو!" میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

"بھائی جان!" شاہد نے مجھے سمجھایا۔ "یقین کیجئے پہلے میں اور آپا جی بھی ان باتوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے لیکن جب سے رانی باجی پر اثر ہوا ہے ہم بھی روحوں کے وجود اور جادو کے قائل ہو گئے ہیں۔"

"لیکن میں پھر بھی نہیں مانتا۔" میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا۔" اس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن باجی دورہ کی حالت میں جو بھی پیش گوئی کرتی ہیں ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔"

"مثلاً ـــ؟" میں نے پوچھا۔

"آج سے ایک ماہ قبل ہی باجی نے آپ کے حیدرآباد آنے کی پیش گوئی کر دی تھی۔" شاہد نے بتایا۔

"ہیں ـــ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"صرف یہی نہیں ـــ بلکہ دورہ کی حالت میں ان کی آواز بھی بدل جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باجی کے اندر سے کوئی بول رہا ہے۔" شاہد نے مزید انکشاف کیا۔

"ناممکن... قطعی ناممکن۔" میں نے ٹیبل پر گھونسہ مار کر کہا۔ "یہ سب تم لوگوں کا وہم ہے۔"

یہ سن کر وہ بے چارگی سے میرا منہ تکنے لگا۔

"اچھا یہ بتاؤ اس پر دورہ کب پڑتا ہے؟" میں نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا۔

"اس کا کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ دورہ کسی بھی دن پڑ سکتا ہے۔ ویسے تقریباً چار ماہ سے دورہ شام ہی کو پڑتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ہر روز شام کو تمہارے گھر آیا کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ "میں رانی کو دورہ کی حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس گفتگو کے بعد ہم دونوں ہوٹل سے نکل کر اپنے گھروں کو چل دیے۔

مگر اگر میں نے رانی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ رانی کے بارے میں خالہ اور شاہد نے جو باتیں بتائی تھیں وہ نہایت ہی حیران کن تھیں لیکن میرا دماغ کسی بھی طرح سے انہیں تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جادو، سایہ اور روح ـــ یہ سب میری سمجھ سے باہر تھے میں ان باتوں پر جتنا بھی غور کرتا الجھتا ہی چلا جاتا۔ اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ انسان نے خلا کی وسعتوں میں قدم رکھ دیا ہے، ایسی باتیں فضول سی نظر آتی تھیں۔

سائنس ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ عقل انسانی خود حیران ہے پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان ابھی تک توہمات کے چکر میں پڑا رہے۔

خالہ اور شاہد نے مجھے جو کچھ بتایا تھا میں اس کی مادی توجیہہ تلاش کرتا رہا۔ جب میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تو یہ فیصلہ کر کے سو گیا کہ ممکن ہے رانی کے دوروں کا عین مشاہدہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکوں۔ اس دن کے بعد سے میں ہر روز شام کو خالہ کے گھر جانے لگا۔ اس دوران میں نے رانی میں صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ وہ کہ دن ڈھلے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کمرے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔ رانی اپنی مسہری پر لیٹ کر گھنٹوں چھت کو تکتی رہتی۔ اس دوران خالہ اس کے کمرے میں فلیتہ جلا دیتیں۔

رانی اسی طرح چھت کو تکتے تکتے سو جاتی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی شاہد یا خالہ اسے آواز دیتے اور وہ اٹھ بیٹھتی۔ پھر باہر آ کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔

خالہ کا خیال تھا کہ پیر صاحب کے فلیتوں کا یہ کمال ہے کہ روح ابھی تک رانی پر قابض نہ ہو سکی۔ ورنہ ہفتہ میں ایک بار تو اسے دورہ پڑ ہی جانا چاہیے تھا۔ اس طرح دو ہفتے سے زیادہ دن گزر گئے۔

پھر ایک دن جب کہ سورج نے مغرب کی سمت شفق کی لال چادر میں اپنا منہ چھپا لیا تھا، شاہد اور خالہ صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور رانی حسب معمول اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ تبھی ہمارے پاس سے گئے۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، خالہ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بظاہر ہم سے باتیں کر رہی تھیں لیکن ان کی ساری توجہ رانی کی جانب تھی۔

اس دن میری طبیعت میں بھی کچھ ہیجان سا تھا۔ میں نے صرف آسیب زدہ لوگوں کے بارے میں سُن رکھا تھا۔ خود کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس قسم کی حرکتوں کو محض ذہنی فتور سمجھتا تھا۔ ابھی ہم لوگوں نے پوری طرح چائے بھی نہیں پی تھی کہ اچانک کمرے سے رانی کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ خالہ جان گھبرا کر اس کے کمرے کی طرف دوڑیں۔ میں اور شاہد بھی ان کے تعاقب میں کمرے کی طرف گئے۔

جب ہم کمرے میں پہنچے تو رانی مسہری پر دوزانو بیٹھی قہقہے لگا رہی تھی۔ میں نے چند لمحے اُسے دیکھا اور پھر بے اختیار رانی کہہ کر چیخ پڑا۔ اس نے اپنا نام سنتے ہی سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اُف خدایا! اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی مانند سُرخ تھیں۔ خوف سے میں کانپ اٹھا۔

اس نے اپنے سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا جس سے اس کے تمام بال کھل گئے۔

"میں رانی نہیں ہوں" رانی نے منمناتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں اپنی جگہ پر دم بخود رہ گیا۔ کیونکہ یہ آواز رانی کی نہیں تھی۔

پھر اس نے 'ہوں، ہوں' کی لمبی آواز کے ساتھ اپنے سر کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ اب اس پر عجیب طرح کی جنونی کیفیت طاری تھی۔ وہ پوری قوت سے جھوم رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی 'ہوں، ہوں' کی آواز بھی بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے سر کے بالوں سے ایک مسحور کن خوشبو نکل رہی تھی۔ جب آواز کافی بلند ہو گئی تو خالہ جان نے ایک فلیتہ جلایا اور رانی کی ناک کے سامنے کر دیا۔

"ہٹاؤ! اسے" رانی نے گرجدار آواز میں کہا۔ "میں اس طرح بھاگنے والا نہیں" اور پھر پہلے ہی کی طرح تیزی سے جھومنے لگی۔ فلیتہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ خالہ جان دوسرا فلیتہ جلانے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن اس دوران رانی نے دوبارہ قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اور چند منٹ بعد وہ پلنگ پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سو رہی ہو۔

رانی کی اس عجیب حالت نے مجھے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کر دیا۔ میں کبھی بھی آسیب کا قائل نہ ہوتا اگر رانی مردانہ آواز میں بات نہ کرتی۔ یہ آواز کس کی تھی، کہاں سے آتی! میں جتنا سوچتا الجھتا چلا جاتا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ رانی کے "آسیب" کی حقیقت معلوم کر کے دم لوں گا۔

اس کی خاطر میں نے نفسیاتی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور رانی کو ہر طریقے سے آزمایا۔ وہ جب نارمل ہوتی تو اسے دَورہ کی کوئی بھی بات قطعی یاد نہیں رہتی۔ البتہ وہ اتنا ضرور بتاتی تھی کہ دورہ سے قبل اسے ایک ایسا جانور نظر آتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں بندر کی طرح ہیں اور باقی تمام جسم انسانوں جیسا ہے۔

وہ شخص یا جانور، جس کے ہاتھ پاؤں بندر نما ہیں نہایت حسین ہے۔ وہ جب بھی نمودار ہوتا ہے ایک عجیب طرح کا رقص کرتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ ایک تو اس کا حسن اور سے اس کا دل فریب رقص رانی کو مدہوش کر دیتا ہے۔ وہ ہستی کچھ دیر تک رانی کے سامنے رقص کرتی رہتی ہے اور جب رانی پورے انہماک سے رقص دیکھنے لگتی تو اسے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

رانی کے اس بیان کی روشنی میں چند عاملوں سے میں نے بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہندوؤں کے "ہنومان جی" ہیں۔ جنہیں رانی پر مسلط کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ مجھے کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جس کی وجہ سے رانی کے دوروں کی معقول توجیہ پیش کر سکتا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے 'روحانیت' کا سہارا لیا۔

مستانی

حیدرآباد پیروں، فقیروں اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کا شہر ہے۔ یہاں اللہ کے نیک بندوں کے مزارات ہیں جہاں ہر وقت مست قلندروں کے جمگھٹ لگے رہتے ہیں۔

اب میرا کام صرف یہ تھا کہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد کسی بھی مشہور درگاہ پر جاتا اور جس کو بھی اپنے خیال کے مطابق عامل سمجھتا اس کے سامنے اپنا مدعا بیان کر دیتا۔

کچھ لوگ مجھے جھوٹی تسلی دینے کی غرض سے تعویذ وغیرہ بھی دیتے اور اسے استعمال کرنے کے عجیب سے تکے طریقے بتاتے۔ چند نیم پاگل قسم کے لوگ جنہیں مجذوب کہا جاتا تھا رانی کا آسیب اتارنے بھی آئے لیکن رانی کی نادیدہ قوت نے ان کی وہ گت بنائی کہ انہوں نے دوبارہ ادھر آنے کی قسم کھالی۔

اس طرح تقریباً پانچ ماہ گزر گئے۔

اب تک کے حالات نے مجھ اس بات کا مجھے پختہ یقین دلایا کہ اس دنیا میں روحوں آسیب اور جادو وغیرہ کا وجود ہے۔

میری کوشش یہ تھی کہ ماہر نفسیات، کوئی پیر، کوئی فقیر، کوئی بزرگ ایسا مل جائے جو نہ صرف رانی کو اس روح سے نجات دلا دے بلکہ مجھے بھی "روح" کی حقیقت سے آگاہ

کر دے لیکن میں ابھی تک اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

پھر ایک شام جب کہ وادی مہران میں سردیوں کی آمد آمد تھی اور میں شاہد تفریح کر کے واپس گھر لوٹ رہے تھے تو گاڑی کھاتہ میں ایک پنواڑی کی دکان پر پان کھانے کی خاطر رک گئے۔

شاہد نے پنواڑی سے دو پان بنانے کو کہا۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے بڑے زور سے میری پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ اور ساتھ ہی ایک نسوانی آواز بھی سنائی دی۔ "پان کھلا"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حیدرآباد کی مشہور خاتون جو مستانی کے نام سے مشہور تھی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا سا پھٹا ہوا میلا کرتا تھا۔ سر کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے جن میں مٹی کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔

اس کو پان کھانے کا بہت ہی شوق تھا اور تمام پنواڑی اسے پان کھلانا اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ مستانی جس دکان سے پان کھا لیتی ہے اس دکان کی سیل بڑھ جاتی ہے۔ مشہور تھا کہ مستانی اگر کسی تانگے میں لمحہ بھر کے لیے بیٹھ جائے تو دن بھر سب سے زیادہ سواریاں اسی تانگے میں بیٹھتی ہیں۔

لوگ اُسے مستانی اس وجہ سے بھی کہتے تھے کہ بعض دفعہ اسے اپنا ہوش بھی بالکل نہیں رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایک انجانے سے کیف و سرور کے عالم میں سڑک پر رقص کرنے لگتی تھی اور اس رقص کے دوران جس کو بھی دعا دے دیتی وہ ضرور پوری ہوتی۔ عام حالت میں وہ سڑکوں پر ماری ماری پھرتی، لوگوں کو برا بھلا کہتی تھی۔ لیکن کوئی بھی اس کی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔

مستانی کے بارے میں عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔ اس کے بارے میں چند ایک کرامات بھی مشہور تھیں۔ ان ہی میں سے ایک

کرامت یہ مشہور تھی کہ مستانی کو کبھی کسی نے بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ لوگوں نے اپنی مرادیں پوری ہونے کی خوشی میں ایک سے ایک اعلیٰ کھانے پکوا کر اس کے سامنے رکھے لیکن مستانی نے ہمیشہ ان سے لاپروائی برتی۔ اور صرف پان کھانے پر ہی اکتفا کیا۔

کچھ لوگوں کے ذہن اس کے برخلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک "پاگل عورت ہے جسے ضعیف الاعتقاد لوگوں نے اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شامل کر دیا ہے اور ساتھ ہی اس کے بارے میں بے سروپا باتیں مشہور کر دی ہیں۔ حالانکہ مستانی صرف اور صرف ایک پاگل عورت ہے۔

میں بھی اکثر مستانی کو مردوں سے باتیں کرتے اور پنواڑیوں سے پان کھاتے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ میری اس سے بات ہوئی ہو۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس وقت اچانک ہی مستانی سے سامنا ہو گیا تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔

اس نے حسب عادت نہایت بے تکلفی سے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر پان کھلانے کی فرمائش کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا پنواڑی نے خود ہی ایک بڑے سے پان کا بیڑا بنا کر اس کی طرف بڑھایا۔ مستانی کے میلے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے دیر سے کھایا ہوا پان فٹ پاتھ پر تھوک دیا۔ اور پنواڑی سے بولی" رکھ لے بیٹا، تیرے سے پھر کام نکلے گا" اور مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔ "پان کھلا!"

مستانی کے جسم سے اٹھنے والی بدبو نے ہم دونوں کو ناک پر رومال رکھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر شاہد سخت لہجہ میں بولا" معاف کرو!"

اس کے خیال میں یہ حواس باختہ عورت فقیرنی تھی۔

"کیوں، پیسے نہیں ہیں کیا؟" مستانی نے ڈھٹائی سے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہم دونوں کے سامنے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کھول دی۔ اس کی مٹھی

میں ایک روپیہ کا نیا نوٹ دبا ہوا تھا۔

ہم دونوں اس بات سے متاثر ہونے کے بجائے روکھے پن سے بولے۔

"پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو۔ بدبو کے مارے دماغ پھٹا جا رہا ہے"

"پان کھلا دو۔ بدبو بھی دور ہو جائے گی" مستانی نے شرارت سے کہا۔

اس کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گلاب کی خوشبو کا ایک جھونکا میری ناک سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ میں نے پہلی بار نظر بھر کر مستانی کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بڑے عجیب انداز سے بولی" دیکھتا کیا ہے؟ — پان کھلا!"

نجانے کیوں میرے دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نہ رانی کو دکھا دیا جائے۔ شاید یہ حواس باختہ عورت ہی کچھ کر جائے۔

"بابو جی، خوش قسمت ہو جو مستانی نے تم سے پان کی فرمائش کی ہے" پنواڑی مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں کوئی جواب دینے کے بجائے مستانی کے بارے میں سوچنے لگا۔

"ابے، سوچتا کیا ہے، مستانی کو بھی آزما کر دیکھ لے" وہ دیوانوں کی طرح قہقہہ لگا کر بولی۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ پاگل عورت میرے دل کی بات کیسے جان گئی!

میں نے مستانی کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور نہایت ہی سرگوشی میں اس سے بولا" تو ـ پھر چل!"

"ایسے نہیں" وہ زور سے ہنس کر بولی" پہلے پان، پھر کام"

اس عرصہ میں پنواڑی مجھے اور شاہد کو پان دے چکا تھا جسے ہم دونوں اپنے اپنے منہ میں رکھ چکے تھے۔

میں نے پنواڑی سے مستانی کے لیے پان تیار کرنے کو کہا۔ شاہد غالباً ہماری باتوں سے اکتا چکا تھا۔ لہٰذا اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

پنواڑی نے مستانی کو پان دیا۔ مستانی نے پان منہ میں رکھا۔ پھر میرا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر سڑک کی طرف کھینچتے ہوئے بولی "چل، دیکھتی ہوں، کون ہے!"

مستانی کا یہ جملہ میرے لیے معنی خیز تھا۔ گاڑی کھاتہ کے لوگ اس کی عادت سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب مستانی موج میں ہوتی ہے تو وہ اسی طرح راہ چلتے لوگوں سے باتیں کرتی ہے۔

ابھی وہ میرا ہاتھ پکڑے چند قدم ہی چلی ہوگی کہ سڑک پر گزرتے ہوئے ایک تانگہ والے نے ازراہ مذاق پوچھا "مستانی!... کدھر؟"

"اپنے سسرال" مستانی نے بے ساختہ جواب دیا۔ پھر اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بولی "کیا مجھے گھر نہیں پہنچائے گا؟"

تانگہ والا فوراً ہی رک گیا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ آج مستانی نے خود ہی تانگہ میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں مستانی کے ساتھ پیچھے اور شاہد آگے تانگے والے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر ہم خالہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں شاہد نے بار بار مستانی سے اظہار بیزارگی کیا۔ لیکن میرے دل و دماغ سے یہ صدا آتی تھی کہ آخر اسے آزما لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ پھر بھی اسے مزید کریدنے کی خاطر میں نے کہا "مائی مستانی! اسکے سامنے تو کوئی ٹھہرتا ہی نہیں ہے"

"ابھی اُسے کوئی مرد کا بچہ ملا ہی نہیں ہے" مستانی نے جواب دیا۔

"سوچ لے، سمجھ لے" میں نے اسے متنبہ کیا "وہ اچھے اچھوں کو بھگا چکی ہے"

"ارے! مستانی کو بھگانے والا ابھی پیدا ہی نہیں ہوا" اس نے دانت پیس کر کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ زور سے ہنس کر تانگہ والا سے بولی "کیوں بھائی میرے ساتھ بھاگے گا؟"

"رحم کر مائی" تانگہ والا ہاتھ جوڑ کر بولا "تیرے ساتھ تو ہوائی جہاز بھی نہیں بھاگ سکتا"

اور جب میں نے تانگہ والے سے اس بارے میں وضاحت چاہی تو اس نے بتایا "مستانی پلک جھپکتے ہیں سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے مستانی کو ایک ہی وقت میں کئی شہروں میں بھی دیکھا ہے۔ یہ اس کی تیز رفتاری کی مثال ہے"

تانگہ والے کی یہ بات سن کر میں مسکرا دیا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر ملوہ پرستی نے جھرجھری لی تھی۔ مائی مستانی کی اب تک کی باتوں سے میں نے صرف یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور اور پھر جہاں بہت سے پیروں اور فقیروں کو آزمایا جا چکا تھا، وہاں مستانی کو آزما لینے میں کیا حرج تھا۔

جس وقت ہم لوگ گھر پہنچے تو سورج ڈوب چکا تھا اور رات کی سیاہی آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ خالہ جان صحن میں بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ اور رانی حسب معمول اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ مائی مستانی عین صحن کے بیچ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

خالہ جان نے ایک نظر مستانی پر ڈالی اور مجھ سے بولیں "ارے بیٹا! اسے تم کہاں سے پکڑ لائے۔ یہ تو پاگل عورت ہے۔ دن بھر گلیوں میں بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے"

"زندگی کھیل کا ہی نام ہے" مائی مستانی خالہ سے مخاطب ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی رانی اپنے کمرے کے دروازہ پر نمودار ہوئی۔ اسے معمول کے مطابق کسی انجانے ذریعہ سے مستانی کی آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ ہی دیر میں وہ مستانی کو گالیاں دینا شروع کر دے گی۔ اور اگر پھر بھی وہ نہ بھاگی تو دست و گریباں ہو جائے گی۔ رانی دروازہ کے درمیان میں کھڑی مستانی کو گھور رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

مستانی نے بھی اپنی نگاہیں رانی کی نگاہوں میں گاڑ رکھی تھیں۔ وہ دونوں پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو تکے جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں سمِ رزم کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

حق اور باطل کا یہ معرکہ کچھ عجیب نوعیت کا تھا۔ ہم سب دم بخود کبھی رانی اور کبھی مستانی کو دیکھ رہے تھے۔ مائی مستانی کے چہرے پر جلال برس رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی گلاب کی خوشبو کا جھونکا ہم سب کے دماغ کو معطر کر جاتا تھا۔ قریب قریب پانچ سات منٹ تک وہ دونوں نظریں ملائے رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ رانی کی نظریں جھکتی چلی گئیں۔ جیسے اسے شکست ہو گئی ہو۔ اب وہ فرش کو تک رہی تھی جیسے وہ شرمندہ ہو۔

"بس، بیٹا ہار گئے!" پرسکون فضا میں مائی مستانی کی آواز گونجی۔ پھر وہ اپنے سامنے زمین پر ہاتھ مار کر بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں بولی: "آؤ بیٹا! یہاں آ جاؤ"

رانی نے ایک نظر مستانی کی طرف دیکھا اور دوبارہ گردن جھکا لی۔

"آ جاؤ بیٹا، آ جاؤ" مائی مستانی نے دوبارہ اس ہی لہجے میں رانی کو مخاطب کیا۔

لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہ ہوئی۔

"ایسے نہیں مانو گے" مائی مستانی نے مسکرا کر کہا۔

پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور وہی ہاتھ زمین پر زور سے دے مارا۔ اس کے ساتھ ہی رانی اپنی جگہ سے اس طرح اچھلی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ پھر دوسرے ہی لمحہ وہ چاروں ہاتھوں پیروں سے بندر کی طرح چلتی ہوئی مستانی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

"اوہو! تو یہ تو ہے!" مائی مستانی کے لہجے میں قدرے حیرت نمایاں تھی۔

ہم سب بے جان بتوں کی مانند گم سُم بیٹھے دیکھ رہے تھے۔

"بیٹھ جاؤ" مستانی نے نہایت رُعب سے رانی کو حکم دیا۔

رانی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ لیکن اس نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مستانی کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کر رہی ہے۔

"میری طرف دیکھو" مائی مستانی رانی سے مخاطب ہوئی۔

"دور ہو یہاں سے!" رانی نے اسے بُری طرح دھتکارا اور اُٹھ کر جانے لگی۔

اس ہی لمحہ مائی مستانی نے اپنی میلی قمیض کا دامن دانتوں میں دبا لیا۔ رانی جوں کی توں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ہم سب نے دیکھا۔ اس نے جانے کی خاطر دو تین بار پاؤں اٹھائے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کے پاؤں سختی کے ساتھ زمین سے جکڑ دیئے ہوں۔

مائی مستانی دانتوں میں اپنی قمیض کا دامن دابے مسکرا رہی تھی۔

پھر رانی آہستہ آہستہ خود ہی فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

"اسے، اسے کیوں تنگ کرتا ہے؟" مائی مستانی نے رانی سے پوچھا۔

"میری مرضی" رانی نے ہنس کر جواب دیا۔

اب اس کی آواز بالکل ہی بدل چکی تھی۔ وہ مردوں جیسی بھاری آواز میں باتیں کر رہی تھی۔

"تیری مرضی نہیں چلے گی" مائی مستانی نے غصہ سے کہا۔

"تیری مرضی بھی نہیں چلے گی" رانی نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"میری مرضی چلے گی" مائی مستانی کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"اری جا، یہ میری معمول بن چکی ہے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں" رانی نے اس ہی طرح زور سے ہنس کر جواب دیا۔

"تیری محبت کی ایسی تیسی۔ سچ سچ بتا، تو یہاں کیوں آیا ہے!" مائی مستانی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

جواب میں رانی نے تیزی سے مستانی کے سر کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اُس کے بال پکڑنا چاہتی تھی۔ لیکن مستانی چوکنی تھی۔ اس نے جھکائی دے کر سر کو بچایا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولی: "خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے آہستہ سے زمین پر ہاتھ مارا۔ رانی سہم کر سمٹ گئی۔

"بتا، کیوں آیا ہے؟" مستانی نے دوبارہ فضا میں ہاتھ بلند کر کے پوچھا۔

"جا جا! اپنا کام کر۔" رانی نے لاپروائی سے جواب دیا اور ساتھ ہی زمین پر زور سے ہاتھ مارا۔

زمین پر دھپ کی آواز کے ساتھ ہی مستانی اپنی جگہ سے اس طرح اچھلی جیسے کسی نے ٹھکرا کر دیا ہو۔

"کیا تو اللہ والوں سے مقابلہ کرے گا؟" مائی مستانی نے دوبارہ اپنی جگہ پر جم کر بیٹھتے ہوئے کہا: "مستانی سے مقابلہ کرے گا؟ ۔ اسے اللہ کی دیوانی کے مقابلے پر آئے گا؟ آ، آ، پنجہ لڑائے گا؟"

اتنا کہہ کر مستانی نے اپنے سیدھے ہاتھ کا پنجہ رانی کی طرف بڑھا دیا۔

رانی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہاتھ زمین پر مارنے کی خاطر اٹھا دیا۔ مستانی نے اپنے ہاتھ کے پنجے کا رخ رانی کی طرف کر رکھا تھا۔ رانی نے زمین پر زور سے ہاتھ مارا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک دل خراش چیخ مار کر اپنا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اللہ کی دیوانی سے لڑے گا!" مائی مستانی نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر طنز کیا۔ اور ساتھ ہی پنجہ زمین پر گاڑ دیا۔ مائی مستانی نے جیسے ہی پنجہ زمین پر گاڑا، رانی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ رانی کے منہ سے خر خر کی آواز نکلنے لگی۔ خالہ جان سے رانی کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ اس کے ساتھ ہی مائی مستانی

کڑک دار آواز سے بولی: "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

خالہ جان پھر ویسے ہی دم سادھ کر بیٹھ گئیں۔

"چھوڑ دے، مجھے چھوڑ دے۔" رانی گھٹی گھٹی آواز میں چلائی۔

"پہلے بتا تو کیوں آیا؟ کس نے تجھے بھیجا؟" مستانی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے زمیندار کے لڑکے نے بھیجا ہے۔ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔" رانی نے بے بسی سے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی خالہ اور شاہد اس طرح چونکے جیسے خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔ اب انہوں نے سمجھا کہ کافی عرصہ قبل شادی سے انکار پر اصغر نے یہ نازیبا حرکت کی ہے۔

مائی مستانی نے ایک نظر ہم سب کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی پنجہ ہٹا کر زمین پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی: "اچھا چل، اب بھاگ یہاں سے۔"

اس کے ساتھ ہی رانی نے اپنی کمر پکڑ لی جیسے مستانی نے اس کی کمر پر ہاتھ مارا ہو۔ پھر سے پھر جیسے مستانی پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ وہ زمین پر مسلسل پوری قوت سے ہاتھ مار رہی تھی اور صحن میں رانی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ زمین پر مائی مستانی کا ہاتھ پڑتے ہی رانی اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصہ کو چیخ مار کر پکڑ لیتی تھی جیسے مستانی اُسے براہِ راست مار رہی ہو۔

پھر دیکھتے دیکھتے رانی کے سر کے عین درمیان سے چند بال اوپر کو اٹھنا شروع ہو گئے۔ یہ منظر ہم سب کے لیے حیرت انگیز تھا۔ مستانی جوں جوں زمین پر ہاتھ مارتی جاتی تھی، رانی کے سر کے بال اوپر کو اٹھتے جاتے تھے اور جب بال کسی حد تک بٹ دے ہوئے تو مستانی نے آگے ہاتھ بڑھا کر انہیں نوچ لیا۔

اس کے ساتھ ہی رانی بے ہوش ہو کر زمین پر لڑھک گئی۔ ہم سب جو بت بنے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، ایک دم اس کی جانب بڑھے۔

"اس کی شادی اُس ہی سے کردے ورنہ پچھتائے گا۔" مائی مستانی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر وہ اپنا لمبا کرتا جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور بے ہوش رانی کو اندر لے جانے کے لیے کہا۔

میں نے خالہ جان اور شاہد کی مدد سے رانی کو اٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئے۔ لیکن اسی لمحہ جب کہ ہم سب رانی کو پلنگ پر لٹا رہے تھے صحن میں سے مستانی کی آواز سنائی دی" ارے او، بے یقین! پان تو کھلا دے۔"

"ابھی دیتی ہوں،" خالہ نے کمرہ میں سے ہی جواب دیا۔ اور جلدی سے رانی کے سر کے نیچے تکیہ رکھ کر باہر نکل آئیں۔ میں بھی شاہد کے ساتھ ہی باہر آگیا تاکہ مائی مستانی کو انعام دے سکوں اور اس آسیب کی حقیقت معلوم کرسکوں۔ لیکن صحن خالی پڑا تھا۔ اور خالہ جان حیرت کی تصویر بنی کھڑی تھیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مستانی آواز کے ساتھ ہی کہاں غائب ہو گئی۔

میں اور شاہد باہر کی طرف بھاگے لیکن باہر بھی گلی بالکل ویران پڑی تھی۔ میں نے اسے حیدرآباد کی ہر سڑک پر، ہر گلی میں تلاش کیا وہ کہیں بھی نہ مل سکی۔

تلاش

اس واقعہ کے تین ماہ بعد ایک روز شام کے وقت میں نے مستانی کو شاہی بازار میں دیکھا۔ میں فوراً ہی اس کی طرف لپکا۔ یہ رات کے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت شاہی بازار میں بہت ہی کم رش ہوتا تھا۔ بیشتر دوکاندار اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ اور اس طرح خرید و فروخت کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہو گئی تھی۔

مستانی مجھ سے دس پندرہ قدم آگے جا رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اُسے آواز دی۔ مستانی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں سمجھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اور شاید وہ رک جائے گی لیکن وہ تو ماحول سے بے خبر مارکیٹ کی طرف گامزن تھی۔

میرا خیال تھا کہ دس پانچ قدم تیز چلوں گا اور مستانی کو جا لوں گا۔ لیکن نہیں۔ میں جتنا تیز چلتا، فاصلہ ویسے ہی قائم رہتا اور یہ فاصلہ ایسا تھا کہ اسے شاہی بازار جیسے تنگ اور بھرے بازار میں آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے لیکن نہ جانے کیا بات تھی، میں جب بھی لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا مجھے مستانی ویسے ہی پہلے والے فاصلے پر جاتی ملتی۔

اس طرح ہم دونوں مارکیٹ تک آگئے۔

اُس زمانے میں مارکیٹ کے پیچھے چوراہے پر پان والوں کی دکانیں تھیں۔

مستانی ایک پان والے کی دکان پر جا کر رک گئی۔ پنواڑی نے فوراً ہی مستانی

کی پسند کا پان بنا کر اُسے پیش کیا۔ اتنی دیر میں میں وہاں پہنچ گیا۔

مستانی نے ایک نظر مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولی "پان کھائے گا؟"

"نہیں، پان میں کھلاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

دراصل اس طرح میں چاہتا تھا کہ اُسے احسان مند کر کے اپنے مطلب کی بات کروں۔

"پان کھلائے گا!" مستانی نے مجھ سے قدرے تعجب سے پوچھا اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگا کر پنواڑی سے بولی "لو سنو! یہ مجھے پان کھلائے گا!"

"بابو جی! اسے پان کھلانا آسان نہیں ہے۔" پنواڑی نے مجھے سمجھایا۔ "بہتر ہے اسی سے پان کھا لو۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا مستانی پنواڑی سے بولی "اسے پان دو بیٹا۔"

پنواڑی نے ایک سادہ پان بنا کر میری طرف بڑھایا اور اس سے پہلے کہ میں پان لیتا مستانی نے اس کے ہاتھ سے اُچک لیا۔ اور پھر میرے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "اپنے متوالے کو میں خود پان کھلاؤں گی۔"

مستانی کے اس جملے پر میں جھینپ سا گیا۔ پنواڑی بھی مسکرانے لگا۔ لیکن کیا کرتا، بادلِ نخواستہ پان اس ہی کے ہاتھ سے کھانا پڑا۔

پان۔ وہ پان جسے مستانی نے اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا۔ یقین جانیے اس جیسا پان پھر کبھی کھانے کو نہیں ملا۔ اس کی خوشبو اور لذت آج بھی کبھی کبھی زبان پر محسوس ہو جاتی ہے۔

پان کھانے کے بعد میرا منہ جیسے بند ہو گیا۔ میں کہتا ہوں دنیا کی لذیذ سے لذیذ کھانے کی چیز بھی اس پان کے ذائقے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

پان کھلانے کے بعد مستانی مارکیٹ کے چوراہے سے تھوڑا آگے بڑھی اور تانگہ اسٹینڈ کی دوسری جانب کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھ گئی۔

میں اس کے پیچھے ہی تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی بھی نہیں ہوتا، صرف تانگوں کی لمبی سی قطار ہوتی تھی۔ تیز چلتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے؟ اب میرا پیچھا چھوڑ دے۔" مستانی نے مسکرا کر کہا۔

"مستانی!" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "اس دن تو کہاں غائب ہو گئی تھی؟"

"میں کہاں غائب ہوئی تھی۔" مستانی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "میں تو تم سب کے سامنے ہی تھی لیکن اگر تم سب اندھے ہو گئے تو میں کیا کرتی۔"

"مستانی! میں ..... میں ..... یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی پر کس کا آسیب تھا!" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہنومان تھا وہ، زمیندار کے بیٹے نے بھیجا تھا۔" مستانی نے اسی طرح لاپروائی سے جواب دیا۔

"مستانی! ..... " میں نے اسے مخاطب کیا اور پھر سوچنے لگا کہ اس سے اپنے دل کی بات کس طرح کروں۔ کیا یہ جواس باختہ عورت واقعی کوئی ماورائی ہستی ہے؟

"جا! اب مجھے تنگ نہ کر۔" مستانی نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"نہیں، مستانی نہیں۔ مجھے بتا یہ ہنومان کون ہے۔ اسے کس طرح بھیجا سکتا ہے! کیا آسیب کا وجود ہے؟ کیا جادو واقعی اثر رکھتا ہے؟" میں نے ہمت کر کے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

مستانی پاگلوں کی طرح خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے اُسے میری عقل پر شبہ ہو۔ پھر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے تانگے والے کی طرف دیکھ کر بولی "تو مجھے بے عزت کرنا چاہتا ہے، مجھے بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔ مجھ سے شادی کر لے۔

مستانی کے ان جملوں سے میں گھبرا سا گیا۔ تانگہ والا بھی میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

ان دنوں حیدرآباد کی آبادی اتنی زیادہ نہ تھی اور اوباش قسم کے نوجوان اکثر فقیر عورتوں سے غیر اخلاقی باتیں کیا کرتے تھے اس وقت میں نے مستانی کے پاس سے چلا جانا ہی بہتر سمجھا کیونکہ وہ واقعی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی تھی میرے دماغ میں نہ جانے کیوں بات سما گئی تھی کہ مستانی کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ وہی میرے دل کے اندر موجزن تجسس کو ختم کر سکتی ہے۔

گو کہ مستانی نے میرے سوالوں کا جواب نہایت ہی احمقانہ انداز میں دیا تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ اس طرح اس نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مستانی کی بے تکی باتیں سننے کے بعد بھی اس کو کسی بھی صورت میں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ رات کا کچھ حصہ گزر جائے اور جب ہر جانب سناٹا ہو جائے تو ایک بار پھر مستانی سے مطلب کی بات کروں گا۔ یہی سوچ کر میں ایک ایسی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے مجھے وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

رات بھیگتی جا رہی تھی۔ میں تانگوں کی آڑ میں کھڑا تھا۔ مستانی کافی فاصلے پر کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھی کاغذ کے ٹکڑوں سے کھیل رہی تھی۔ فلم کا آخری شو ختم ہو چکا تھا۔ قطار میں صرف دو چار ہی تانگے رہ گئے تھے۔ سڑک پر اکا دکا آدمی جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی گزرتی تو اس کے پیچھے چند آوارہ کتے بھونکتے ہوئے دوڑنے لگتے۔

مارکیٹ کے ٹاور نے رات کے ڈیڑھ بجنے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی مستانی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھ گئی۔ اب اس کا رخ قبرستان کی طرف تھا جس کے ایک کنارے پر سرفراز شاہ بابا کا مزار واقع ہے۔

یہ صدیوں پرانا قبرستان تھا جو کہ ہیرآباد کی پہاڑی کے نشیب سے شروع ہوتا تھا اور زیر تعمیر سراج کالونی پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ دوسری جانب غریب آباد سے لے کر

پولیس گراؤنڈ اور دادن شاہ کے پڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ہی قبرستان کے آخری سرے پر اللہ کے نیک بندے سید سرفراز شاہ بابا کا مزار واقع ہے۔ جو کہ آج کل زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ یہ جگہ دن میں بھی ویران رہا کرتی تھی لیکن اب یہاں پٹھان کالونی اور سرفراز کالونی واقع ہیں اور قبروں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

مستانی نہایت ہی نپے تلے قدموں سے اس قبرستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اور اس اندھیرے میں وہ ایک ہیولی کی مانند نظر آ رہی تھی۔ میں ماحول سے ذرا سا خوف زدہ ہوا۔ لیکن مستانی کے وجود نے میری ہمت بندھائی۔ گو کہ اسے علم نہیں تھا کہ میں پیچھے پیچھے آ رہا ہوں لیکن مجھے ڈھارس تھی کہ مستانی آگے جا رہی ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ قبرستان میں داخل ہوتے ہی مستانی کو روک لوں گا۔ اور جب تک وہ میرے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دے گی اسے نہیں چھوڑوں گا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ پہاڑی کی ڈھلان پر جہاں سے قبرستان میں جانے کے لیے پگڈنڈی سی بنی ہوئی ہے ایک کوٹھری بنی ہوئی ہے۔ مستانی اس کوٹھری میں داخل ہو گئی۔

دن میں اس قبرستان سے میرا بارہا گزر ہوا ہے۔ کیونکہ میرے چند دوست سراج کالونی میں رہا کرتے تھے اور مارکیٹ سے سراج کالونی تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ اسی قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی پہلے کبھی اس قبرستان میں کوئی کوٹھری نہیں دیکھی تھی۔ اور پھر یہ کوٹھری تو رات کی سیاہی میں صاف نظر آ رہی تھی جیسے اس پر سفید رنگ کیا گیا ہو۔

مستانی کوٹھری کی دائیں جانب گھوم کر اندر گئی تھی سامنے کی جانب ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جس کے پٹ بند تھے لیکن درزوں میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہ

تھی۔ میں نے یہ دیکھنے کی خاطر کہ اس کوٹھری کے اندر کون ہے ایک باریک سی درز سے آنکھ لگا دی۔ اندر اس قدر تیز روشنی تھی کہ میری آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ اور مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے ایک بار آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلا اور دوبارہ جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی پیٹھ پر کسی کے ہاتھ کا احساس ہوا۔ میں نے کھڑکی سے گردن ہٹا کر دیکھا میرے پیچھے ایک نہایت ہی سفید ریش بزرگ ہاتھ میں تسبیح لیے کھڑے تھے۔ ان کے نورانی چہرے پر نظر پڑتے ہی میں کانپ اٹھا۔ ابھی میں کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ انہوں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے نہایت ہی ملائم لہجہ میں کہا۔ "بیٹا! اس طرح جھانکنا اچھی عادت نہیں۔ جب یہاں تک آ ہی گئے ہو اندر چلو۔"

اتنا کہہ کر بزرگ دروازہ کی جانب چل دیئے۔ پھر میں ان کے پیچھے ہی کوٹھری میں داخل ہوگیا۔ کوٹھری کے اندر سفید دودھیا رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اس قدر تیز تھی کہ سوئی میں دھاگہ ڈالا جاسکتا تھا۔ میں نے دوبارہ آنکھوں کو جلد جلد جھپکایا اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ مجھے اس روشنی کا منبع کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

کوٹھری کے آخری سرے پر دیوار کے قریب، زمین سے تقریباً ایک فٹ بلند تخت تھا جس پر نہایت دیدہ زیب قالین بچھا ہوا تھا۔ اور اس تخت پر سفید بے داغ لباس میں ملبوس مستانی بیٹھی ہوئی تھی۔

مستانی کا حسن، نہیں اُسے حسن نہیں کہا جاسکتا۔ وہ تو نور تھا۔ ایسا نور جس کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ مستانی کے دائیں ہاتھ میں سرخ رنگ کے دانوں کی تسبیح تھی اور اس میں سے نہایت ہی ہلکی سُرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کوٹھری گلاب کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

مادّہ اور رُوحانیت

مستانی نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور نہایت ہی شیریں لہجے میں بولی "خان! آخر تم یہاں تک آ ہی گئے۔ کس تجسس نے تمہیں میرا پیچھا کرنے پر مجبور کیا ہے؟"

کوٹھری کے ماحول اور پھر مستانی کی پُراسرار شخصیت نے مجھ پر ہیبت طاری کردی۔ میں کیا جواب دیتا۔ گم سُم کھڑا اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔

"بولو خان! کیا بات ہے، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے دوبارہ سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"میں.... میں چاہتا ہوں.... "دل کی بات زبان پر آکر رک گئی۔ الفاظ ہونٹوں پر آکر رہ گئے۔

میری بدحواسی دیکھ کر اس کے چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ پھیل گئی جس نے اس کے حسن کو اور بھی دوبالا کردیا۔ وہ اسی طرح دلآویز تبسم کے ساتھ بولی "میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔" پھر وہ لمحہ بھر کو رُکی۔ اس نے تسبیح کو بوسہ دیا اور مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئی "یاد رکھو خان! اس کائنات میں کوئی راز راز نہیں ہے۔ لیکن اس کائنات سے انسان اسی وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ ان اصولوں کو صدقِ دل سے اپنا لے جو اس کائنات کے خالق نے بنائے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ رُک گئی۔ شاید اُسے مجھ سے کسی جواب کی توقع تھی۔ لیکن میں تو ابھی تک حیرانگی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے شعور پر آج بھی مادہ کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی ہے لیکن اس میں قصور تمہارا نہیں ہے کیوں کہ اس کائنات میں ہر شئے مادہ سے بنائی گئی ہے۔ اور پھر انسان اس مادی ماحول سے اتنا زیادہ متاثر ہو چکا ہے کہ ذرا سی بھی تبدیلی اس کے لیے نہ صرف حیران کن ہوتی ہے بلکہ پریشانی کا باعث بھی بن جاتی ہے"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مادہ اپنی ہیئت تبدیل کرتا رہتا ہے" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں" مستانی نے جواب دیا۔ اصل راز جاننے کی خاطر سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مادہ کیا ہے" مادہ کی اصل کیا ہے۔ یہیں جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے، جو کچھ بھی سنائی دیتا ہے، ہم جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں کیا یہ سب حقیقت ہے؟"

"تم نے مادہ پر شک کیا ہے حالانکہ مادہ پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے، ہم جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں، وہی حقیقت ہے" میں نے جواب دیا۔

"اگر تمہاری بات کو تسلیم کر لیا جائے.... تو پھر.... یہی دیکھ لو—"

اتنا کہہ کر مستانی نے اپنے اطراف ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب کوٹھری کا ماحول تھا۔

مستانی کے اس اشارے پر میں چونکا اور بمشکل تمام کہا "یہ ماحول میرے لیے اجنبی ہے۔ یہ اتنا پراسرار ہے کہ میں ابھی تک حیران ہوں۔ میری عقل ابھی تک اس کی توجیہ نہیں تلاش کر سکی ہے"

"اور اس کی توجیہ تلاش کی بھی نہیں جا سکتی" مستانی نے ہنس کر کہا "کیوں کہ قبرستان میں داخل ہوتے ہی تمہارے حواس خمسہ کی تمام باطنی قوتیں جاگ اٹھیں اور اب

تم کو جو کچھ نظر آ رہا ہے، حقیقت ہے"

"اسے نظر بندی بھی تو کہا جا سکتا ہے" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ حواس خمسہ کی قوتوں کو دھوکا دینا ہی کمال ہے۔ اور مداری یہی کمال دکھا کر سب کو حیرت زدہ کر دیا کرتے تھے۔

"ہاں، تم کہہ سکتے ہو کیونکہ تم ابھی مادہ کی حقیقت اور اس کائنات کی اصلیت سے واقف نہیں ہو" مستانی نے اطمینان سے جواب دیا پھر تخت پر پہلو بدل کر بولی — "لیکن جہاں تک نظر بندی کا تعلق ہے اس کا حقیقت سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس میں صرف حواس خمسہ کی ایک قوت "بصیرت" ہی کو دھوکا دیا جا سکتا ہے اور وہ بھی وقتی طور سے"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کائنات کے بارے میں حواس خمسہ کی قوتیں ہمیں دھوکا دیتی ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ انسان کسی بھی حقیقت کو اس ہی وقت تسلیم کرتا ہے جب حواس خمسہ کی تمام قوتیں اس پر گواہ ہو جائیں۔ یہ حقیقت اور سچائی کا معیار ہے" مستانی نے جواب دیا "اس وقت تم جس ماحول میں موجود ہو اس کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ہو کیونکہ تمہارے حواس کی تمام قوتیں اسے قبول کر رہی ہیں"

"کیا مطلب؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب صاف ظاہر ہے۔ اس کائنات کی موجودگی کا احساس ہم کو حواس ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں حواس کے ذریعے ہی کرتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو حواس کی انمول نعمت سے نوازا ہے اور جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں انہیں اس کائنات کا تو کیا اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ دنیا والے انہیں پاگل کہتے ہیں"

مستانی کے اس مدلل جواب کو سن کر میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی۔

"حواس خمسہ کی بھی دو قسمیں ہیں" مستانی نے دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کیا "ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ حواس خمسہ کی قوتیں جن کی ہمیں پہچان کراتی ہیں اس کا اظہار ہر حواس کی ایک قوت، قوت گویائی سے الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں۔ گویا حواس اور الفاظ اس کائنات کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ اچانک سفید ریش بزرگ سے مخاطب ہوئی "مہمان کی خاطر کچھ ہو تو لاؤ۔"

سفید ریش بزرگ جو دیر سے خاموش کھڑے تھے یہ سنتے ہی ایک پتلی دروازہ میں داخل ہو کر غائب ہو گئے۔

"حواس خمسہ کی دو قسمیں ہیں" مستانی نے ایک گہری سانس لے کر دوبارہ کہنا شروع کیا "ایک ظاہری اور دوسری باطنی" اس نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا "ظاہری قوت مادے کے باہر دیکھتی ہے۔ جب کہ باطنی قوت مادہ کے اندر جھانکتی ہے اور اس کی حقیقت کو پہچانتی ہے اور جب یہی قوت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ یہ کائنات انسان کے لیے مسخر ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان روحانی دنیا کا باسی ہوتا ہے اس کائنات کی حقیقت جاننے کے بعد وہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا حق دار ہوتا ہے۔"

مستانی کی اس عالمانہ گفتگو نے مجھے محو حیرت کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح کی قلندرانہ طبیعت کی مالک علم نفسیات اور مابعد النفسیات پر اس قدر دسترس رکھتی ہو گی۔ اب میں احساس کمتری کا شکار ہو چکا تھا۔ مستانی کے سامنے میری حیثیت خاک کے ذرے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ علم کا ایک ایسا دریا تھی جس کی تہہ نہیں تھی۔ لیکن میں بھی آسانی سے شکست ماننے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کی عالمانہ گفتگو پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا "میں تمہاری کوئی بھی بات نہیں سمجھا۔"

"تم ان باتوں کو آسانی سے سمجھ بھی نہیں سکو گے" مستانی نے نہایت ہی شفقت سے کہا "اس کائنات کی حقیقت جاننے کی خاطر انسان کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے" وہ مجھے سمجھانے والے لہجے میں بولی "اس حقیقت کو بھی جاننے کے دو طریقے ہیں" اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کیا "ایک مادی طریقہ ہے جس میں کسی بھی شئے کے بارے میں مادی وسائل سے غور و فکر اور مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور جسے جدید دور میں سائنس بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جسے مذہب کہا جا سکتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اس کا طریقۂ کار موجود ہے۔ اور لوگ اپنے اپنے مذہب کے طریقۂ کار کے مطابق جسمانی اور روحانی ورزش کر کے اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"مذہب سے اس کائنات کا کیا تعلق ہے!" میں نے اسے ٹوکا۔

"بہت گہرا تعلق ہے" مستانی نے تخت پر ہلکے سے ہاتھ مار کر کہا "حق تعالیٰ نے یہ کائنات بنائی ہی اس لیے ہے کہ انسان وحدانیت کو پہچان لے، قدرت کو مان لے اور اس مقصد کی خاطر اُسے مذہب کا لباس پہنایا ہے۔ مذہب کے بغیر انسان اس کائنات کو نہیں پرکھ سکتا اور جب وہ اس کائنات کو نہیں جان سکتا تو خالق کائنات کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اس کے علاوہ بھی تمہاری سائنس" اس نے انگلی سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اس کائنات میں ہر شئے کا اپنا مرکز ہے اور انسان کا مرکز مذہب ہے۔ جو شئے مرکز سے ہٹ جاتی ہے وہ اس وقت تک بھٹکتی رہتی ہے جب تک واپس مرکز پر نہ آ جائے۔ اس ہی طرح وہ لوگ جو اپنے مرکز یعنی مذہب سے ہٹ کر اس کائنات کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں وہ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں!"

اتنا کہہ کر وہ کچھ رکی اور پھر بولی "میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے ذہن میں مذہب اور

اس کائنات کے تعلق سے جو شک تھا وہ ختم ہو گیا ہو گا۔

"کسی حد تک" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"تمہارے دماغ میں یہ شک بھی اس وجہ سے پیدا ہوا کہ دنیا کے دوسرے مذاہب میں اس کائنات کی حقیقت جاننے کا جو طریقہ کار رائج ہے وہ نہایت ہی مشکل اور صبر آزما ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اس کائنات کو پہچانتے ہیں۔ اور حق تعالےٰ کے قریب ہوتے ہیں"۔

"لیکن، بہرحال ان میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں، جو ماورائی علوم پر دسترس رکھتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"خان!" وہ نہایت ہی سنجیدگی سے بولی "ہمیں دوسروں کے بارے میں بحث کرنے کا حق نہیں ہے ضروری یہ ہے کہ پہلے ہم اپنے مذہب کو دیکھیں۔ پہلے ہم اس کو جانچیں۔ جب ہی ہم دوسروں کی اچھائیوں اور برائیوں کو بھی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔

"چلو، یوں ہی سہی" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"دین، جسے اسلام کہا جاتا ہے نہایت ہی اعلیٰ و ارفع ہے" مستانی دوبارہ گویا ہوئی "یہ دین میرے محبوب حق تعالےٰ کا سب سے پیارا دین ہے اور اس ہی ناطے سے یہ نہایت ہی مقدس اور قوی دین ہے۔ اس کے بارے میں میرے محبوب نے فرما دیا ہے کہ یہ قیامت تک قائم رہے گا۔ اور جانتے ہو یہ قیامت تک کیوں کر قائم رہے گا؟"

مستانی کے اس سوال کے جواب میں، میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس لیے کہ انسانیت کو اس دین میں مکمل کر دیا گیا ہے" اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔

میرے سامنے سفید ریش بزرگ ایک نقرئی تھال میں دودھ کا گلاس اور انگور کا خوشہ لیے کھڑے تھے۔ میں نے تھوڑا سا دودھ پیا۔ یہ دودھ نہیں، شربت تھا۔ نہایت ہی لذیذ اور خوشبودار۔ میں صرف چند گھونٹ ہی پی سکا پھر میں نے گلاس دوبارہ تھال میں رکھ دیا۔ سفید ریش بزرگ نہایت ہی ادب سے میرے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"تم کہتی ہو اسلام میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے رہنمائی موجود ہے" میں نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن یہ میں نہیں کہتی ہوں" مستانی نے احتیاط سے جواب دیا "یہ حق تعالےٰ کا فرمان ہے۔ یہ میرے محبوب کا حکم ہے۔ کیونکہ دین اسلام حقیقت سے بعید نہیں اس ہی وجہ سے اسے دین فطرت بھی کہا جاتا ہے"۔

"اس کا ثبوت کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ثبوت!" اس نے جیسے میرے الفاظ کو دوہرایا "ثبوت ایک نہیں ہزاروں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تمہاری عقل ساتھ دے"۔

"عقل ہمیشہ حقیقت کو تسلیم کرتی ہے" میں نے جواب دیا۔

"اور میں بتا چکی ہوں کہ اسلام حقیقت سے بعید نہیں" مستانی نے قدرے مسکرا کر جواب دیا۔

"خان!" وہ سمجھانے والے انداز سے بولی۔ "سب سے پہلے انسان کو اپنی حقیقت جاننا چاہیے" مستانی نے ذرا ٹھہر کر کہا "اسلام کے نزدیک انسان ایک ایسی ہستی ہے جو جسم، روح اور عقل کا مرکب ہے اور یہ تینوں عنصر انسان کی ذات میں اپنا اپنا فریضہ پورا کر رہے ہیں۔ اب یہ فرض انسان کا ہے کہ وہ ان عناصر کے تعاون سے کائنات و مافیہا کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے۔ یہی حق تعالےٰ کی مشیت

ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ انسان جسم، روح اور عقل سے مل کر بنتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے!" مستانی خوشی سے بولی۔ "انسانی وجود کے لیے جسم روح اور عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہ انسان کی حقیقت ہے۔ جسم روح اور عقل کے بغیر خاک کا ڈھیر ہے ــــ جسم مادہ ہے۔ جسم حاضر ہے۔ جب کہ عقل اور روح غائب عنصر ہیں۔ عقل کو نہ کسی نے پایا ہے اور نہ ہی کسی نے دیکھا ہے۔" میں نے کہا

"اس ہی طرح روح ہے۔ عقل اور روح کی ....." ابھی میں اتنا ہی کہ پایا تھا کہ مستانی بات کاٹ کر بولی۔ "عقل کیا ہے ــــ انسانی سوچ ہے۔ اور انسانی سوچ وہی ہے جو ہم کو حواس بتاتے ہیں۔ حواس کے متبادل انسان جو کچھ کرتا ہے وہ بھی اس کی سوچ ہے، عقل ہے۔ یہی حال روح کا ہے۔ یہ بھی غائب عنصر ہے۔ اسے بھی کسی نے نہیں دیکھا لیکن اس کا وجود قوی ہے کیوں کہ روح مرکز خیالات ہے۔ اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ اور روح کے بغیر وحدانیت نہیں، روح کے بغیر حقانیت نہیں۔"

ابھی مستانی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دور کہیں سے فجر کی اذان بلند ہوئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر..." مستانی نے ایک دم سلسلۂ کلام ختم کر دیا اور گردن جھکا کر نہایت ہی احترام سے اذان سننے لگی میں کبھی مستانی اور کبھی کوٹھری کے در و دیوار کو تکنے لگتا۔

ایک تو موضوع اہم تھا پھر مستانی کے سمجھانے اور بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ اذان ختم ہوتے ہی میں نے کئی عورتوں کو سفید، سبز اور زعفرانی لباس پہنے کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان کا آدھا چہرہ نقاب سے چھپا ہوا تھا۔

وہ دو دو اور تین تین کے غول میں کوٹھری کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اور

نہایت ہی ادب سے مستانی کے پیچھے کھڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ کوٹھری جلد ہی عورتوں سے بھر گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب عورتیں نہیں آئیں گی کیوں کہ کوٹھری میں بیٹھی عورتوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن وہ برابر آئے چلی جا رہی تھیں۔ پھر جو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو عورتوں کی قطاریں ہی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔

یہ ایک ایسا روح پرور منظر تھا کہ مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔ عورتوں کا ایک جم غفیر تھا جو مستانی کی قیادت میں نماز ادا کر رہا تھا۔

میری نظر سفید ریش بزرگ پر پڑی جو بغلی دروازہ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے انہیں روکتے ہوئے پوچھا "محترم بزرگ! یہ سب کیا ہے، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

میری بات سن کر بزرگ کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ وہ نہایت ہی سرگوشی میں بولے "بیٹا! یہ وہ دنیا ہے جسے ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔"

"لیکن، یہ خواتین کون ہیں! کہاں سے آئی ہیں!" میں نے پوچھا۔

"یہ خواتین!" بزرگ نے اسی طرح سرگوشی سے جواب دیا "یہ وہ خواتین ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں نیک کام کیے اور باری تعالیٰ ان سے خوش ہیں۔ یہ اسی قبرستان میں دفن ہیں، یہ قبرستان ہی ان کا مسکن ہے۔"

اتنا کہہ کر سفید ریش بزرگ تیزی سے بغلی دروازہ میں داخل ہو گئے۔ میں نے پلٹ کر مستانی کو ایک نظر دیکھا۔ وہ نہایت ہی شیریں لہجہ میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری تھا۔ اور پھر مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر سفید ریش بزرگ کے پیچھے لپکا۔ لیکن یہ کیا.....؟ دروازہ میں داخل ہوتے ہی میں ایک قبر کے پاس کھڑا تھا۔

اب وہاں نہ کوئی کوٹھری تھی، اور نہ ہی خواتین کی جماعت۔ قبرستان کا ویرانہ میرے گرد تھا۔ میں نے گھبرا کر چاروں جانب دیکھا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! کہیں میں خواب تو نہیں

دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا، اگر یہ خواب تھا تو پھر میں قبرستان میں کیسے پہنچ گیا۔

اپنے اس شک کو دور کرنے کی خاطر میں نے آنکھوں کو خوب ملا، ہاتھوں کی انگلیوں کو کاٹا اور جب یقین ہو گیا کہ جو کچھ دیکھا تھا خواب نہیں تھا تو ایک قبر کے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب میرے ذہن میں گزرے ہوئے لمحات دوبارہ آنا شروع ہو گئے ۔

میں نے مستانی کو شاہی بازار میں دیکھا تھا۔ اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے مارکیٹ کے چوراہے تک آگیا تھا جہاں اس نے مجھے نہایت ہی لذیذ پان کھلایا تھا۔ پھر وہ تانگہ اسٹینڈ کے پاس کوڑے کے ڈھیر پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ یہیں اس نے مجھے روحوں کے بارے میں بتانے کے بجائے احمقانہ انداز سے گفتگو کی تھی اور پھر آدھی رات گزرنے کے بعد وہ اس ویران قبرستان کی طرف چل دی تھی اور میں بھی اس کے پیچھے ہی یہاں تک آگیا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ کوٹھڑی کے اندر مستانی سے جو باتیں ہوئیں اور۔۔۔ بعد میں اس کی جو قدر و منزلت نظر آئی ۔۔۔ وہ سب حقیقت تھی۔

اب تاریکی چھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ سپیدۂ سحر پھیل رہا تھا ۔ مستانی مجھے قبرستان کے آخری سرے پر جاتی دکھائی ۔۔ اس نے وہی معمولی سا میلا کرتا پہن رکھا تھا۔

میں نے جلدی سے آنکھوں کو ایک بار پھر ملا اور پوری قوت سے چلّا کر اسے آواز دی آواز سنتے ہی اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ میں تیزی سے بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

وہ اپنی میلی آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے بولی: "تو ابھی تک یہاں ہے گھر نہیں گیا؟"

"نہیں ۔۔ مستانی نہیں ۔۔ میں گھر نہیں جاؤں گا۔" میں نے پھولی سانس سے جواب دیا۔

"گھر جا، خان! آرام کر۔ ورنہ لوگ تجھے بھی میری طرح پاگل سمجھنے لگیں گے۔" مستانی نے سمجھایا۔

"تو کون ہے ۔۔ یہ سب کیا ہے، مجھے بتا۔ ورنہ۔۔۔۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

"میرے بارے میں جاننے سے زیادہ تمہیں خود اپنے بارے میں جاننا چاہیے" مستانی نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "لیکن، مشکل تو یہ ہے کہ تمہیں اپنا ہوش نہیں ہے۔ اور۔۔۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"تو پھر، کیا۔۔۔ میں یوں ہی رہ جاؤں گا۔" میں نے پوچھا۔

"سوچنا تو یہی ہے۔" اس نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے زور سے قہقہہ لگا کر مخاطب ہوئی "مجھ سے عشق کرے گا!"

میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلا دی

"ٹھیک ہے۔ اگر تیرا عشق سچا ہے تو آدھی رات کے بعد جیک تالاب پر آجانا" مستانی نے جیسے مجھے حکم دیا۔ "جا، اب گھر جا!"

اتنا کہہ کر وہ دیوانوں کی طرح تیز تیز قدم۔ تھانی مارکیٹ کی طرف چل دی

میں بُت بنا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

جیک تالاب۔ حیدر آباد شہر کے باہر معصوم شاہ کلہوڑا کے مقبرے کے پیچھے نشیب میں واقع تھا۔ اس تالاب میں نہ صرف بارش کا پانی جمع رہتا تھا بلکہ ایک بڑی سی نالی کے ذریعے پھلیلی نہر کا پانی بھی اس میں آجاتا تھا۔

کہتے ہیں انگریز افسر سر جیکب نے یہ تالاب اپنی فوج کے گھوڑوں کو پانی پلانے کی خاطر بنوایا تھا۔ یہ وہی سر جیکب ہیں جن کی یادیں کراچی میں جیکب لائن اور سندھ میں جیکب آباد ابھی تک قائم ہیں۔

اس تالاب میں مچھلیاں بھی ہوتی تھیں۔ اور مچھلی کے شکار کے شوقین حضرات اکثر یہاں آکر مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔

میں اسکول کے زمانے میں اکثر دوستوں کے ساتھ معصوم شاہ کلہوڑہ کے مقبرے تک آیا کرتا تھا۔ اور یہیں سے نشیب میں واقع جیکب تالاب کو دیکھا کرتا تھا۔ کیوں کہ یہ جگہ شہر سے باہر تھی، اس لیے جنگل ہی کا حصہ نظر آتی تھی۔ اب تو جیکب تالاب کا دامن سمٹ کر کم ہو چلا ہے اور حیدرآباد کی آبادی اس کے کناروں تک پہنچ چکی ہے۔

مستانی نے مجھے آدھی رات کو اس جگہ بلایا تھا جب کہ لوگ دن میں بھی بہت ہی کم ادھر کا رخ کرتے تھے۔ ایک بار تو جی میں آیا کہ وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دوں لیکن روحوں کا بھید جاننے اور مستانی کی پُراسرار شخصیت نے مجھے وہاں جانے پر مجبور کر دیا۔

میں رُوحانیت کا قائل ہو گیا

مستانی کی ملاقات سے قبل، میں جتنے بھی ولیوں، مجذوبوں، قلندروں اور مستانوں سے ملا ہوں، ان سب کے بارے میں میرا خیال ہے کہ میں "دیوانوں" سے ملا ہوں۔ روحانیت کیا ہے، ماورائی علوم کیا حیثیت رکھتے ہیں مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے خود اپنے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، انسان کیا ہے اور اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، یہ وہ موضوعات تھے جن سے میرے کان ناآشنا تھے

میں علم نفسیات کا ماہر نہیں ہوں لیکن رائی پر اثر ہو جانے کے بعد میں نے اس کے ازالہ کی خاطر جو کچھ پڑھا اس نے کسی حد تک مادہ پرست بنا دیا تھا۔ مذہب سے میرا تعلق صرف روزہ اور نماز کی حد تک تھا۔ اسلام کیا ہے اور کیا کہتا ہے۔ اس سے میں بے خبر تھا۔ مجھے اللہ کے نیک بندے کہلوانے والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ملا جو مجھے درسِ انسانیت دیتا، جو مجھے مذہب کا سبق پڑھاتا، جو مجھے اس کائنات کی حقیقت بتاتا، جو مجھے خود میری حیثیت سے باخبر کرتا۔

مستانی سے قبرستان میں ملاقات ہونے کے بعد میرے ذہن سے مادہ پرستی کی گرد جھڑنا شروع ہو گئی۔ اس نیک ہستی نے جس طرح مادہ پرستی کے بتوں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا، وہ اسی کا حصہ تھا۔

میرا ذہن اچھی طرح سے صاف نہیں تھا۔ دریا کے قریب ہو کے بھی میں تشنہ لب رہ گیا تھا۔ میں مستانی کی علمی بصیرت کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ اور علم کے اس دریا سے پوری طرح فیضیاب ہونا چاہتا تھا۔ مستانی نے مجھے جھیک تالاب پر بلایا تھا۔ اور میں کشاں کشاں حصول علم کی خاطر، آدھی رات کو، جھیک تالاب کی طرف چل دیا۔

میں نے جیسے ہی میرآباد اور سینٹرل جیل کی حدود کو پار کیا، ویرانی کا احساس شدت سے ہوا مگر دل مضبوط کر کے معصوم شاہ کلہوڑہ کے مقبرے تک میں پہنچ ہی گیا۔

مقبرہ کے پیچھے نشیب میں جھیک تالاب تھا جس کا پانی رات کی سیاہی میں جھلملا رہا تھا۔ اس تالاب کے بیچ کنارے ایک جھونپڑی بنی ہوئی تھی جس کی دیواریں مٹی کی تھیں۔ جھیک تالاب کے چاروں جانب دور دور تک ببول کے درخت اور خودرو جنگلی جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ مجھے ان جھاڑیوں میں سے گزر کر اس جھونپڑی تک پہنچنا تھا جس کی ایک کھڑکی میں سے مدہم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

مستانی نے مجھے جھیک تالاب پر بلایا تھا۔ اس نے کسی جگہ کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ سامنے کوٹھڑی میری منزل ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ پہاڑی سے قدم جما کر نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اور جب میں نیچے پہنچا تو گزشتہ رات والے سفید ریش بزرگ کو چند قدم کے فاصلے پر کھڑا پایا۔ میں ان کی جانب تیزی سے بڑھا۔ بزرگ نے قریب پہنچتے ہی کہا: "آؤ میاں، خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔"

اس کے بعد وہ مجھے لیے ہوئے اسی کچی کوٹھڑی میں داخل ہو گئے۔ اس کوٹھڑی کے اندر ایک جانب طاق میں ایک لالٹین رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بانوں سے بنا ہوا پلنگ پڑا تھا۔ ایک طرف کونے میں مٹی کا چولہا بھی تھا اور کھانا پکانے کے چند برتن لکڑی کے ایک بوسیدہ سے صندوق پر رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں مستانی ایک چٹائی پر بیٹھی تھی۔

اس وقت بھی اس کے جسم پر وہی لمبا سا ڈھیلا ڈھالا کرتا تھا۔ لیکن یہ کرتہ سفید اور بے داغ تھا۔ ایک سبز رنگ کا بڑا سا رومال یا شاید وہ دوپٹہ تھا جسے مستانی نے سر کے گرد اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ کنپٹیوں کے بال بھی نظر نہیں آتے تھے۔

اس کے سامنے رحل پر قرآن پاک کھلا ہوا تھا۔ اور وہ تلاوت میں مشغول تھی۔ آج مستانی مجھے نہایت ہی سادہ اور پُروقار انداز میں ملی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بولی۔ "میں جانتی تھی کہ تم آؤ گے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟ تم کو میرے دل کا حال کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پھیکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

"تمہارا ذہن جاگ چکا ہے۔ کائنات کی حقیقت جاننے کا خیال بیدار ہو چکا ہے اور تجسس کا یہی جذبہ ہے جو تمہیں مجھ تک پہنچنے پر مجبور کرتا ہے۔" مستانی نے جواب دیا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب آکر بیٹھنے کو کہا۔

میں قریب پہنچا تو اس نے سمٹ کر چٹائی پر بیٹھنے کو جگہ دی۔ میں اس کے دائیں جانب سامنے بیٹھ گیا۔ چٹائی نہ جانے کس چیز کی بنی ہوئی تھی، وہ عام چٹائیوں سے مختلف تھی۔ نہایت ملائم، موجودہ زمانے کے فوم کے گدوں کی مانند۔

چٹائی پر بیٹھنے کے بعد وہ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔ "تمہیں جس منزل کی تلاش ہے وہاں تک پہنچنے کی ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے لیکن منزل تک وہی لوگ پہنچتے ہیں جن کو رہبر کامل مل جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو ایک نہ ایک دن منزل پا لو گے لیکن یاد رکھو!" وہ انگلی اٹھا کر بولی۔ "اس منزل تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے صراط مستقیم۔ اگر تم اس راستے سے بھٹک گئے تو عمر بھر ان پگڈنڈیوں پر سرگرداں رہو گے جو بظاہر منزل کی طرف جاتی نظر آتی

ہیں لیکن درحقیقت وہ اس راستے کے مسافر کو عمر بھر اپنے گرد چکر لگواتی رہتی ہیں۔"

"تم درست کہہ رہی ہو۔ اگر راہی منزل سے بھٹک جائے تو منزل تک نہیں پہنچ سکتا یہ سچ ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے میرے خیالات کی تائید لفظ 'سچ' بول کر کی ہے س، و، چ مل کر لفظ سچ بناتے ہیں سچ یعنی حقیقت مستانی بولی "بس جان لو۔ جب تمہارے منہ سے نکلے ہوئے ان دو حروف میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مل کر حقیقت کا مظہر بن جاتے ہیں تو پھر الفاظ کا اگر ایسا ذخیرہ مل جائے جس کے ایک ایک حرف میں کائنات کی حقیقت پوشیدہ ہو تو کیا انسان اس کائنات کے رازوں سے آگاہ نہ ہو جائے گا!"

مستانی نے حروف اور الفاظ کی جو منطق پیش کی تھی اس نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا۔ میں نے سوچ کر جواب دیا۔ "ضرور لیکن ایسا ہونا ناممکن ہے۔ تم نے حروف اور الفاظ کی جو تعریف بیان کی ہے اس کے مطابق ایسی کتاب کا ملنا مشکل ہے۔"

"تم اسے ناممکن سمجھتے ہو جب کہ ہر بات ممکن ہے۔ تم ایسی کتاب کا ملنا مشکل سمجھتے ہو جب کہ ایسی کتاب موجود ہے۔" مستانی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"وہ کتاب کونسی ہے؟" میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

مستانی نے میری بات کا جواب دینے سے قبل کھلے ہوئے قرآن کے درمیان بوسہ دیا اور پھر اُسے بند کر کے بولی۔ "وہ کتاب قرآن ہے۔ یہ وہ عظیم اور مقدس کتاب ہے جس کے ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ میں کائنات کی حقیقت پوشیدہ ہے۔"

مستانی کے اس انکشاف سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی کیوں کہ مجھے علم تھا کہ تصوف کے رسیا ہر بات میں قرآن کو بیچ میں لاتے ہیں۔

میں نے نہایت مایوسی سے پوچھا۔ "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں قرآن کی اہمیت اور حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔" مستانی نے

جواب دیا۔ اور پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ "قرآن وہ عظیم کتاب ہے جو انسان کو نہ صرف بھلائی اور راست بازی کا سبق دیتی ہے بلکہ قرآن ہمارے اوپر ان فارمولوں کو ظاہر کرتا ہے جن پر یہ کائنات قائم ہے۔ اور جن فارمولوں کی بنا پر کائنات ہمارے لیے مسخر کر دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ قرآن میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔"

"اگر تمہاری بات کو تسلیم کر لیا جائے تو مسلمانوں کو دنیا کی نہایت ہی ترقی یافتہ قوم ہونا چاہیئے تھا۔" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"بالکل۔ بالکل۔" مستانی تائیدی لہجے میں بولی۔ "آج سے سینکڑوں سال قبل جب کہ مسلمان زندگی کی ہر سانس کے ساتھ قرآن سے استفادہ کرتے تھے، وہ دنیا کی نہایت ہی ترقی یافتہ قوم تھے۔ آج کی ترقی یافتہ قومیں ان کے سامنے سرنگوں رہتی تھیں۔"

"لیکن آج یہی قوم دنیا کی پس ماندہ قوم ہے۔ اگر وہ ترقی یافتہ تھے تو اتنی جلد پستی میں کیوں چلے گئے؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک اس قوم نے "اللہ کی رسی" کو مضبوطی سے تھامے رکھا، دنیا پر حکمرانی کی۔" مستانی نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جب اس رسی کو چھوڑ دیا، اللہ سے بیگانہ ہو گئے۔ دنیاوی جاہ و جلال کے چکر میں پڑ گئے تو ایسی صورت میں سوائے پستی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے رہتے تو کبھی بھی پس ماندہ نہ ہوتے۔" میں نے کہا۔

"یقیناً۔" مستانی عزم سے بولی۔ "کیوں کہ قرآن کائنات پر ہماری حاکمیت اور سرداری تسلیم کرتا ہے لیکن ہم قرآن کو محض برکت کی کتاب سمجھ کر طاقوں میں سجائے رکھتے ہیں۔ اور جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اس کی تلاوت کر کے نجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔"

"اس کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر قرآن میں تفکر ہمارا شعار بن جائے تو ساری کائنات پر ہماری سرداری مسلّم ہے۔" وہ تمکنت سے بولی۔

"تمہاری اس بات کو محض مذہبی جوش و جذبے کا نام دیا جا سکتا ہے، ورنہ . . . .
وہ صرف اور صرف ایک دینی کتاب ہے جس میں احکامِ خداوندی موجود ہیں۔ پچھلی قوموں کے عروج و زوال کا ذکر ہے اور چند پیغمبروں کے تذکرے درج ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے یہی پڑھا ہے۔ جو پڑھا ہے، جو سمجھا ہے کہہ دیا ہے۔" مستانی قدرے تحمل سے بولی۔ "قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑا فرق ہے۔ لیکن تم نے جو پڑھا ہے، اسی ہی پر غور کر لو تو ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔"

"وہ کیسے!" میں نے پوچھا۔

"تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ قرآنِ پاک میں احکامِ خداوندی موجود ہیں؟"

میں نے اس کے اس سوال کے جواب میں اقرار کے انداز سے گردن ہلائی۔

"اچھا۔ اب ذرا غور کرو۔" مستانی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "احکامِ خداوندی انسانوں کی بھلائی کے لیے ہیں۔ اور جب ایسا ہے تو اس کے کسی بھی حرف میں کسی بھی لفظ میں کبھی کوئی تغیر نہیں آسکتا کیونکہ حق تعالیٰ اپنے قوانین کو بدلتا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک اپنے معنوں کے ساتھ ساتھ اپنے الفاظ اور کلمات میں بھی معجزہ ہے۔"

مستانی کے اس جواب نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ میں صرف اس کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔

وہ ٹھہر کر دوبارہ بولی۔ "اب تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ قرآن پاک ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جہاں تک قوموں کے عروج و زوال کا تعلق ہے تو یہ بھی اشارہ ہے ان مادہ پرستوں کی طرف جنہوں نے ترقی کی انتہائی بلندیوں کو چھونے کے بعد وحدانیت سے انکار کیا تھا۔ وہ جو سمجھتے تھے کہ خدا کچھ بھی نہیں ہے، ہم ہواؤں کو روک

سکیں گے، سیلاب آئے گا تو پہاڑوں پر چڑھ جائیں گے۔ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ جہاں تک پیغمبروں کے واقعات کا تعلق ہے، تو وہ بھی روشنی کے مینار ہیں بشرطیکہ ان سے روشنی حاصل کرنے والا ذہن موجود ہو۔ حضرت یوسفؑ کے قصے میں زراعت کا ڈھنگ پوشیدہ ہے حضرت موسیٰ کے قصے میں آگ اور پہاڑ کی خوبیاں پوشیدہ ہیں حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں امورِ سلطنت کے آداب بتائے گئے ہیں حضرت سلیمانؑ کے قصے میں سائنسی راز مخفی ہیں۔

مستانی کی اس گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ قرآن کو مشعلِ راہ سمجھتی ہے۔ اس حقیقت سے مجھے بھی انکار نہیں تھا۔ قرآن انسان کو ضابطۂ اخلاق سکھاتا ہے لیکن جہاں تک دنیاوی مسائل اور مادی ترقی کا سوال تھا، قرآن اس بارے میں کیا رہنمائی کر سکتا ہے یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔

بحیثیت مسلمان میں نے قرآن کو روایتی انداز میں پڑھا تھا۔ اور جو کچھ سمجھا تھا اسی کے مطابق مستانی سے بحث کر رہا تھا۔ مستانی مجھے قرآن کی فضیلت سے آگاہ کرنا چاہتی تھی اور میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آرہی تھیں۔

مستانی لمحہ بھر کو پانی پینے کے لیے رُکی تو میرے دماغ میں کئی سوال ابھرنے لگے۔ اور بالآخر میں نے اس سے پوچھا "قرآن مادی ترقی میں ہماری کیا راہنمائی کر سکتا ہے!"

"جن پیغمبروں کا میں نے نام لیا ہے، ان کے تذکروں میں مادی ترقی ہی کے راز پوشیدہ ہیں۔" مستانی نے جواب دیا۔ "زندگی کی اصل مادہ ہے۔ سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے فکر و عمل سے انسانوں کی مادی خوش حالی میں اضافہ کرے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ مادی زندگی کو اپنا لیں اور روحانی حقیقت سے انکار کر دیں۔ قرآن میں ان ہی لوگوں کے واقعات بیان کرنے کے بعد حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

کیا انہوں نے زمین پر سیر نہیں کی، اور ہم نے بہت سی قوموں کو ہلاک
کر دیا جو اپنی عقل اور وسائل کی فراوانی پر اتراتے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ خدا عقل کا دشمن ہے۔ جب انسان اپنی عقل کے سہارے ترقی کرتا ہے تو پھر ہلاکت کیا معنی رکھتی ہے" میں نے ہلکا سا طنز کیا۔

"تم بات سمجھے نہیں" مستانی زیرِ لب مسکرا کر بولی "عقل انسان کو ترقی کی منازل پر پہنچا کر وحدانیت سے غافل کر دیتی ہے۔ عقل انسان کو سیدھی راہ بھی دکھاتی ہے اور الٹی بھی۔ جب سے انسان نے اس حسین کائنات میں قدم رکھا ہے عقل اس کی دوست بھی ہے اور دشمن بھی۔ اگر انسان نے عقل سے خدا کو پہچانا ہے تو اس ہی کے بل بوتے پر خدا کے وجود سے انکار بھی کیا ہے" پھر وہ تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرتے بولی: "انسان ازل سے مادہ کی ہیئت جاننے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اور اس طرح وہ مادہ پرست بن گیا ہے۔ پچھلی تہذیبوں کی تاریخ میں ان ہی لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے چشمِ تاریخ نے بار بار مشاہدہ کیا ہے کہ مادی ترقی حاصل کر کے وحدانیت کو جھٹلانے والی قوموں کو نقشِ پا کی طرح مٹا دیا گیا ہے۔ قرآن میں ان ہی لوگوں کے واقعات بیان کرنے کے بعد حق تعالے نے آنے والی نسلوں کے لیے جو کچھ فرمایا ہے وہ میں تم کو ابھی ابھی بتا چکی ہوں"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پہلے وحدانیت پر ایمان لانا چاہیے" میں نے پوچھا۔

مستانی نے کہا: "اس انسان پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے جو ایک جانب تو عقل کے بل پر مادہ کی ہیئت پر غور کرتا ہے اور دوسری طرف یہ نہیں سوچتا کہ اس کا موجد کون ہے۔ اس کا خالق، اس کا موجد جو بھی ہے وہی اللہ ہے"

میں نے جواب دیا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ مستانی نے مجھے انتہائی مادہ پرست سمجھ لیا ہے "اللہ پر تمہارا اس قدر اعتقاد ہے؟"

مستانی نے مجھے سوالیہ انداز سے دیکھا۔ پھر ایک دل آویز تبسم سے بولی "حق تعالے نے انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اور یہ کائنات اس کی بھلائی کی خاطر بنائی

ہے۔ اور خلیفہ ہونے ہی کی وجہ سے حق تعالے نے انسان کو نیک اور صالح بنایا ہے پھر اُسے عقل دی۔ ہاں، انسان کی فطرت میں برائی نہیں ہے۔ وہ عقل کی وجہ سے تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ کیوں کہ فطری میلانات کو پورا کرنے میں عقل اس کی معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "تو پھر یہ برائی کہاں سے آتی ہے؟"

مستانی نے اس ہی طرح زیرِ تبسم مجھ سے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "انسان اپنے عمل سے خیر یا شر کماتا ہے اور عمل اس کی عقل کے تابع ہوتا ہے۔ اور یہ عقل ہی اس کا نفس ہے جو بے قابو ہو جاتا ہے تو ابلیس اس پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اور پھر انسان برائی کو برائی سمجھتے ہوئے بھی عمل کر ڈالتا ہے۔ عقل میزانِ عدل ہے۔ جب اس کا پلڑا برائی کی طرف جھکتا ہے تو انسان گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اور جب اچھائیوں کی طرف جھکتا ہے تو انسان عرفان و آگہی کی منزل پا لیتا ہے۔

حق تعالے نے انسان کو عقل دی ہے اور ساتھ ہی یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ چاہے تو اس دُنیا یا سے بھلائی کر کے اپنے لیے جنت میں مقام بنا لے یا پھر برائی کر کے جہنم کو اپنا لے۔ اس بات کو اچھی طرح سے جان لو کہ انسان کے عمل کا دار و مدار عقل پر ہے یہ عقل ہی ہے جس سے انسان وحدانیت کو پہچانتا ہے، حق تعالے کو جانتا ہے۔

میں بڑے ہی غور سے مستانی کی باتوں کو سن رہا تھا، اس کے ہر جملے سے تدبر اور فراست عیاں تھی میں نے دیکھا سفید ریش بزرگ کوٹھری میں نہیں تھے۔

گزشتہ رات جب قبرستان میں میری ملاقات مستانی سے ہوئی تھی تو عقل کا موضوع ادھورا رہ گیا تھا لیکن آج کی ملاقات میں موضوع کسی حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ عقل کیا ہے، کچھ کچھ میری سمجھ میں آ چلا تھا۔ مستانی نے اپنے سر سے دوپٹے کو کھولا اور شانوں پر ڈال لیا اس کے بالوں سے نہایت ہی بھینی خوشبو نکل رہی تھی۔ یہ خوشبو ایسی تھی کہ اس نے

میرے دماغ کو تروتازہ کردیا۔ یک لخت مجھے اپنا ذہن، اپنا جسم ہلکا محسوس ہونے لگا۔ مستانی نے دوبارہ گفتگو شروع کردی: "حق تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا پھر اس کے اندر عقل اور علم پھونکا اور پھر اس کائنات میں اس کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اب ذرا غور کرو۔ جب حق تعالیٰ وسائل کے بغیر حاکم ہے تو اس کا نائب اور خلیفہ بھی وسائل کا دست نگر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہوتا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر حق تعالیٰ کی ذات سے منسلک ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کا نائب بھی اپنے طور سے اس کی تخلیق میں تصرف کر سکتا ہے۔"

"وہ کس طرح سے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ حق تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں پر صدق دل سے عمل کیا جائے اور حق تعالیٰ کے تمام اصول قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن کس قدر افسوسناک بات ہے کہ ہم ہر بات کو جانتے ہوئے بھی عمل نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے پاس ماورائی علوم کا جتنا بڑا خزانہ موجود ہے وہ اس ہی مناسبت سے مفلوک الحال ہیں۔ ہمارے اسلاف نے حاکمیت اور تسخیر کائنات کے بڑے بڑے خزانے ترکے میں چھوڑے ہیں لیکن ہم ہیرے کو پتھر سمجھ کر ان سے بیگانے ہو گئے ہیں اور دوسروں کے نقش قدم پر چلنا ہم نے اپنی روش بنا لیا ہے۔"

"قرآن کے بارے میں تمہارا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے، ابھی تک مجھے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔" میں نے کسی قدر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم اندھے ہو۔" مستانی نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ اس کی پکار کی کرختگی سے میں سہم گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر پھر پہلے ہی جیسی شگفتگی پھیل گئی اور وہ نہایت ہی شیریں لہجے میں بولی: "تمہارے سامنے حقیقت موجود ہے پھر بھی تم ثبوت مانگتے ہو۔ میرے محبوب کی کیا شان ہے کہ سب کچھ تمہارے سامنے ہے اور پھر بھی تمہارے ذریعے مجھ سے ثبوت مانگ رہا ہے۔ بارے واری جاؤں اس شان کے، کہاں کہاں مجھے آزمائے گا

کس کس انداز سے امتحان لے گا۔ ارے میں تو تیری ہوں۔" مستانی نے میرے سر کے اوپر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "تیری ہی بات کروں گی، تیرے رازوں سے پردہ اٹھاؤں گی، انسان کو تیری حقیقت بتاؤں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں میری پیشانی پر قائم تھیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف دیوار پر میرا سایہ تھا۔ میں نے دیکھا مستانی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ زیر لب حق اللہ حق اللہ، حق اللہ کہہ رہی تھی پھر رفتہ رفتہ آواز بلند ہوتی چلی گئی اور مستانی پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ پوری قوت سے جھوم جھوم کر حق اللہ کی صدا لگا رہی تھی۔ اس کے سیاہ لمبے بال گردن کی حرکت کے ساتھ فضا میں پروں کی مانند پھیل پھیل جاتے تھے۔ اور ان میں سے نکلنے والی بھینی بھینی خوشبو نے پوری کوٹھری کو معطر کر رکھا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوٹھری میں چاروں جانب سے حق اللہ کی آواز آ رہی ہو۔ ہر شئے حتیٰ کہ در و دیوار تک حق اللہ کی صدا لگاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے خود پر قابو نہ رہا، میرا دل بے اختیار یہ صدا لگانے پر مجبور کرنے لگا۔ میں جدھر نظر ڈالتا تھا، ہر شئے سے حق اللہ کی صدا آتی تھی۔ مجھے اپنے لباس سے بھی یہی آواز آتی محسوس ہوئی پھر میں خود بھی اس آواز میں ڈوبتا چلا گیا۔ کوٹھری کے در و دیوار اور وہاں موجود ہر چیز سے حق اللہ کی صدا نکل رہی تھی ماحول کی اس گونج میں مستانی کی آواز سب سے بلند اور پرسوز تھی پھر مجھے اپنے تن من کا ہوش نہیں رہا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر میں بھی سر دھننے لگا۔

جذب و مستی کی یہ کیفیت کتنی دیر قائم رہی مجھے اس کا علم نہیں۔ بہرحال، مجھے ہوش اس وقت آیا جب مستانی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ مجھے ہر شئے پہلے ہی کی طرح پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

مستانی کے گلے میں صندل کی لکڑی کی تسبیح پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ میرے برابر پہلے ہی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

میں نے ایک نظر چاروں جانب دیکھا۔ صبح صادق کا اجالا کوٹھری میں داخل ہو رہا تھا۔ تو.... تو... کیا ساری رات گزر گئی۔ ذہن میں خیال آیا۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔ جس وقت میں کوٹھری میں داخل ہوا تھا تو رات کے بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ اس سے جو میری گفتگو ہوئی تھی، اس میں گھنٹہ سوا گھنٹہ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوا تھا ممکن تھا یہ موضوع اور وقت لے لیتا لیکن اچانک ہی مستانی پر بے خودی طاری ہوگئی یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ بحث اس مرحلے میں داخل ہوگئی تھی جہاں مستانی کو خود پر قابو نہ رہا۔ وہ جھوم جھوم کر حق اللہ کی ضرب لگانے لگی تھی۔ اور پھر مجھے نہ جانے کیا ہوا تھا شاید یہ ماحول کا اثر تھا کہ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حق اللہ کی صدا لگانے لگا تھا۔

لیکن، میں نے یہ صدا کتنی دیر لگائی؟ — پندرہ منٹ، بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ۔ اس سے زیادہ میرا شعور ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اور اب جو ہوش آیا تو صبح ہو رہی تھی۔

تو، کیا وقت ٹھہر گیا تھا!

کیا مستانی کو وقت پر قدرت حاصل ہے!

متعدد سوالات میرے ذہن میں ابھرے۔ اور... اور... پھر عقیدت سے میں نے اپنا سر اس کے پیروں پر رکھ کر رکھ دیا۔ "تم... تم... بہت عظیم ہو!"

"میں عظیم نہیں ہوں، فرحان!" مستانی نے میرا سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "عظیم تو صرف اور صرف ذاتِ الٰہی ہے۔ میں تو خاک کا پتلا ہوں۔ عظیم تو وہ ہے جو خاک کے پتلے کو فرش سے عرش تک لے جاتا ہے۔

تم جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہتے ہو، جس کی تمہیں تلاش ہے اس کے لیے سخت محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ انسان کا نفس بڑا ہی ظالم ہے۔ اس بے لگام گھوڑے کو اپنے قابو میں کرو۔ اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاؤ۔" مستانی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی سیکنڈ کے ہزارویں حصہ سے بھی کم وقت میں میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت ہلکا ہوگیا ہوں۔ میرے اندر کوئی وزن نہیں ہے مجھے اپنا دماغ نہایت ہی ہلکا معلوم ہوا۔ میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سی مسرت محسوس کی۔

"یہ میرا اصل ٹھکانہ ہے۔" مستانی اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "تم جب چاہو، یہاں آسکتے ہو۔"

"خوش قسمت ہو بیٹا!" مجھے سفید ریش بزرگ کی آواز سنائی دی۔ وہ کوٹھری کا دروازہ پکڑے کھڑے تھے۔ "اٹھو!" انہوں نے جیسے مجھے حکم دیا۔ "آج سے یہ کوٹھری تمہارا مسکن ہے، چاہو تو آرام کر لو، چاہو تو دودھ گرما پی لو۔ اور چاہو تو ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاؤ۔"

میں ان تینوں ہدایات میں سے کسی ایک پر بھی عمل نہیں کر پایا۔ ابھی میرا نفس میرے قابو میں نہیں تھا۔ میں نے مستانی کی طرف دیکھا۔ وہ گوشے میں بنے ہوئے مٹی کے چولہے میں آگ جلانے میں مشغول تھی۔

میرا ٹھکانہ

اب میرا یہ معمول بن گیا تھا کہ رات کو جب دنیا والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے، میں اپنے پلنگ سے اٹھتا، پاک صاف کپڑے پہنتا اور جھیل تالاب کی طرف چل دیتا۔

صبح صادق کے وقت مجھے آنے کی اجازت مل جاتی۔ رات بھر جاگنے اور عبادت کرنے سے مجھے کبھی بھی تھکاوٹ نہیں ہوئی بلکہ میں نے ہمیشہ خود کو پہلے سے زیادہ خوش و خرم پایا۔ میں نے مستانی کو بتا دیا تھا کہ میں ملازم ہوں۔ مستانی نے مجھے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ پیٹ بھرنے کی خاطر ہاتھ پاؤں چلاؤں لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے دو باتوں کا وعدہ بھی لیا تھا۔ ایک یہ کہ میرے حلق کے نیچے رزق حلال جائے گا۔ دوئم یہ کہ میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں ان دونوں باتوں پر سختی سے قائم تھا۔

میں اب یکسر بدل چکا تھا۔

کوٹ اور پتلون کی جگہ معمولی سے کپڑے کی شلوار قمیض پہننے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل خود بخود نماز کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ اور میں پابندیٔ وقت سے نماز ادا کرنے لگا تھا دفتر کے لوگ میری اس تبدیلی سے حیران تھے۔ ان میں سے کچھ میرا مذاق بھی اڑاتے تھے لیکن مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ میں منزل کی تلاش میں صراطِ مستقیم کی جانب گامزن ہو چکا تھا۔

رزق حلال کھانے اور سچ بولنے سے میری زبان میں اتنی تاثیر ہو چلی تھی کہ بعض دفعہ دفتر میں اپنے ساتھیوں سے ایسی بات بھی کہہ دیتا تھا جو کہ ان کے خیال میں ناممکن ہوتی تھی لیکن میرے کہنے کے مطابق ممکن ہو جاتی تھی۔

بہرحال، کچھ لوگ مجھ سے متاثر تھے مگر کچھ لوگ ناداض اور خوف زدہ سے رہتے تھے۔

مستانی کو بلیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے حجرے کے آس پاس سفید بے داغ، کالے اور بھورے رنگ کی لاتعداد بلیاں گھومتی رہتی تھیں۔

ہر بلی کے گلے میں ایک چھوٹا سا گھنگرو پڑا رہتا تھا جو گھنٹی کا کام دیتا تھا۔ مستانی نے ان بلیوں کے نام بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کوٹھڑی کے اندر بھی آ جاتی تھیں۔ بعض دفعہ مستانی ان بلیوں سے انسانوں کی طرح باتیں بھی کرنے لگتی۔ انہیں ایک شفیق ماں کی طرح سمجھاتی، ادھر نہ جانا، اُدھر نہ جانا ___ جیسے اُسے ان کی حفاظت کا بہت خیال ہو۔ جو بلیاں کوٹھڑی کے اندر آ جاتی تھیں ان کو میں نے مستانی کے منہ اور ہاتھ بھی چاٹتے دیکھا۔ مستانی بھی اس ہی طرح ان سے پیار کرتی تھی۔

وہ جیسے ہی کوٹھڑی کے باہر آتی، یہ میاؤں میاؤں کہہ کر اُسے گھیر لیتیں۔ وہ بڑے ہی پیار سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتی اور بعض دفعہ ان ہی بلیوں میں سے کسی ایک کو گود میں اٹھا کر اُسے بالکل انسانوں کی طرح کام کرنے کا حکم دیتی۔ اور وہ بھی خاموشی سے سر جھکا کر ایک طرف کو چلی جاتی۔ دن میں ان بلیوں کی نگہداشت کا کام وہی سفید ریش بزرگ انجام دیا کرتے تھے۔ کیونکہ مستانی کا سارا دن شہر میں گزرتا تھا۔

میں کبھی کبھی سوچتا، آخر یہ بلیاں مستانی سے اتنی مانوس کیوں ہیں۔ جب کہ وہ سفید ریش بزرگ سے دور دور رہتی تھیں۔ اور اگر میں کبھی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تو وہ اس طرح سے بھاگ جاتی تھیں جیسے کچھ شناسا ہی نہیں۔ بعض دفعہ ان کی حرکتیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا

کر بلیاں نہیں، انسان ہیں۔ بلیوں کا یہ انداز کبھی کبھی مجھے حیرت زدہ کر دیتا تھا۔

میں نے ایک بار مستانی سے ان بلیوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو اُس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی "خان، ہر بات کو جاننے اور سمجھنے کا وقت ہوتا ہے۔"

البتہ کچھ عرصہ بعد، میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان بلیوں کی حقیقت عیاں ہو گئی۔

ایک رات جب کہ میں حسبِ معمول مستانی کے پاس آ رہا تھا تو معصوم شاہ کلہوڑا کی پہاڑی سے جیسے ہی نیچے اترا، آسمان پر زور سے بجلی چمکی۔ جس سے دور تک کا ماحول لمحہ بھر کے لیے روشن ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اب وہاں جیکب تالاب کے کنارے پکی اینٹوں کا ایک دو منزلہ مکان کھڑا ہے۔ لمحہ بھر کی روشنی کے بعد پھر چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا بھی تیز چلنے لگی، یہ بارش کے آثار تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ بادل کہاں سے آ گئے۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو مطلع بالکل صاف تھا اور آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی مجھے بارش نے آ گھیرا تھا اور بارش بھی ایسی تیز تھی کہ اس کی موسلا دھار بوندیں جسم میں گھستی معلوم ہوتی تھیں، پھر طوفانی ہوا بھی چل رہی تھی اور وقفہ وقفہ سے آسمانی بجلی بھی چمک رہی تھی۔

میرا لباس چند ہی لمحوں میں پانی سے شرابور ہو گیا اور ہوا کی شدت سے بدن کپکپانے لگا۔ اب میں اس طوفان سے بچنے کی سوچنے لگا۔ آس پاس کوئی ایسا بڑا درخت بھی نہیں تھا جس کے نیچے پناہ لے سکتا۔

اب میرا رخ مستانی کی کوٹھری کی طرف تھا۔ میں جوں جوں آگے بڑھتا جا رہا تھا، اندھیرے میں مکان واضح ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد، میں ایک دو منزلہ کے سامنے کھڑا حیرت

سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا جیکب تالاب کے کنارے یہ منزلہ مکان کہاں سے آ گیا۔ کہیں میں راستہ تو نہیں بھول گیا ہوں۔ لیکن اس صورت میں بھی مجھے مستانی کی کوٹھری تک ہی پہنچنا چاہیے تھا کیوں کہ اس ویرانے میں سوائے اس کے اور کسی کا مسکن نہیں تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک بارش کے پانی کا ایک زوردار تھپیڑا منہ پر لگا اور میں اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

اس دو منزلہ مکان کا دروازہ کافی بڑا تھا۔ جس پر موٹی لکڑی کے کواڑ لگے ہوئے تھے۔ میں نے کواڑ کے ساتھ لٹکی ہوئی زنگ آلود زنجیر کو پکڑ کر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی بلند آواز میں مستانی کو پکارا۔ میرا خیال تھا کہ میں مستانی کی کوٹھری تک پہنچ گیا ہوں۔ اور اس نے طوفان کی وجہ سے دروازہ بند کر رکھا ہے۔ میری آواز کی بازگشت دور تک سنائی دی۔ پھر کھٹ پٹ.... کھٹ پٹ، اندر سے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ اور چند لمحے بعد، دروازہ آہستہ آہستہ کھلا چلا گیا

دونوں کواڑوں کے کھلتے ہی میں دم بخود کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ میرے سامنے ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ لالٹین ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

اس دوشیزہ کی عمر شکل سے سترہ اٹھارہ سال ہوگی اس نے وادیٔ مہران کا روایتی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ اس کی قمیض پر سامنے کی جانب دامن تک شیشے جڑے ہوئے تھے۔ جو کہ لالٹین کی روشنی میں ستاروں کی مانند جھلملا رہے تھے۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور سامنے مانگ کی جگہ سرخ رنگ کے موتی چمک رہے تھے اس کا سرخ و سفید چہرہ نہایت ہی دلکش تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں کے اوپر گھنی سیاہ پلکیں قوس کی شکل میں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ وادیٔ مہران کا مکمل حسن تھی۔

میں قدرت کی صناعی کے اس بے مثال نمونے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں اس وقت

یہ بھی بھول گیا تھا کہ طوفانی بارش میں کھڑا ہوں۔

"اندر آجایئے۔" اس کے یاقوتی لبوں کو جنبش ہوئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں ایک ساتھ کئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ اس کی آواز بھی اس کی شکل کی طرح حسین تھی۔ پھر وہ دروازہ کے ایک جانب ہٹ کر کھڑی ہوگئی میں نے بلا سوچے سمجھے ایک قدم آگے بڑھایا اور اندر داخل ہوگیا۔ وہ میرے آگے لالٹین سے راستہ دکھاتی چل رہی تھی۔

ہم دونوں ایک لمبی سی راہداری سے گزر کر اوپر کے ایک کمرے میں آگئے۔ اس کمرے میں نہایت پرانے قسم کا فرنیچر تھا۔ دیواروں پر چند قلمی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ جو شاید اس دوشیزہ کے بزرگوں کی ہوں گی کیونکہ لالٹین کی روشنی میں وہ مجھے صاف نہیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"بیٹھ جایئے۔" دوشیزہ نے ایک نہایت ہی پرانی سند سی وضع کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی۔ شکریہ!" میں نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "مستانی کہاں ہے۔" میں نے پوچھا۔

"کون مستانی؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ "یہاں تو صرف میں رہتی ہوں۔"

"تم۔۔۔ تم۔۔ کون ہو، یہ مکان کس کا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں کون ہوں، یہ مکان کس کا ہے۔" اس نے میرے الفاظ کو دوہرایا۔ پھر دائیں جانب والی دیوار کے طاق میں لالٹین رکھ کر بولی۔ "یہاں آنے والا ہر شخص مجھ سے یہی پوچھتا ہے۔"

"تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟" میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے اقرار کے انداز میں گردن ہلا کر جواب دیا۔

"بھلا اس ویرانے میں تمہارا کیا کام؟" میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"یہ ویرانہ میرا مسکن ہے۔" اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ سے کہا۔ پھر بائیں جانب والی دیوار کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آج طوفان بہت تیز ہے۔"

"نہ جانے اچانک یہ طوفان کیسے آگیا۔" میں نے اسی ہی طرح پریشانی سے کہا۔ اور گردن گھما کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ باہر بارش کا طوفان اس ہی طرح زور و شور سے جاری تھا۔

"طوفان ہمیشہ اچانک ہی آیا کرتے ہیں۔" دوشیزہ نے بدستور کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی۔۔۔۔؟" میں نے اس کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"تم۔۔۔ یہاں طوفان سے بچنے کی خاطر آئے ہو؟" دوشیزہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ اور اس طوفان کے ختم ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ اور سردی کی شدت کم کرنے کی خاطر پوچھا "آگ کا انتظام نہیں ہو سکے گا؟"

"فضل آگ ہی لینے گیا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔" دوشیزہ نے جواب دیا۔ پھر خود کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ "سردی مجھے بھی لگ رہی ہے۔"

"فضل کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارا شوہر ہوگا۔"

فضل کا نام سن کر دوشیزہ کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ لیکن جب میں نے اس کو شوہر کہا تو دوشیزہ نے نفی کے انداز میں گردن ہلا دی۔

"فضل کون ہو سکتا ہے؟" میں نے سوچا۔

"دوشیزہ کے رویے نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔

"تم چلے جاؤ گے؟" دوشیزہ نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن طوفان ختم ہونے کے بعد۔" میں نے جواب دیا۔ اور پھر قدرے آگے

کو جھک کر بولا "تم نے بتایا نہیں۔ یہ فضل کون ہے، اس سے تمہارا رشتہ کیا ہے۔؟"

"فضل میرا ساتھی ہے میری خوشی ہے" دوشیزہ نے جذباتی انداز سے کہا، پھر دوسرے ہی لمحہ اُداسی سے بولی "لیکن یہ طوفان مجھے غم دیتا ہے۔ یہ طوفان میرے دکھ کو بڑھا دیتا ہے"

"کیا دکھ ہے تمہیں؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"میرا دکھ ....؟ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ کر بولی "میرا دکھ سنو گے؟"

"سنایئے، ہو سکتا ہے میں کچھ مدد کر سکوں" میں نے جواب دیا۔

دوشیزہ نے یہ سن کر پیٹھ کرسی کی پشت سے لگا دی اور اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر غور سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے بات شروع کرنے کی خاطر الفاظ سوچ رہی ہو۔

پھر کچھ دیر بعد وہ اس طرح گویا ہوئی۔

تڑپتی روح

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ پھیلی نہر حیدرآباد شہر کے نشیب میں بہا کرتی تھی۔ حکومت وقت نے حیدرآباد شہر کو دوسرے بڑے شہروں سے ملانے کی خاطر اس نہر پر پُل بنانے کی اسکیم بنائی۔ اس ہی نہر کے دوسرے کنارے پر میر بحروں جنہیں مچھیرے بھی کہا جاتا ہے، چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد تھے۔ یہ لوگ اس نہر میں کشتیوں کے ذریعے جال ڈال کر مچھلیاں پکڑا کرتے اور یوں اپنے خاندان کا پیٹ بھرا کرتے تھے۔ اسکیم بنی....ا،.... .ورجب اس پر عمل شروع ہوا تو میر بحروں کو بھی متبادل جگہ دینا پڑی۔ کیونکہ حکومت نے پل بنانے کے لیے جو جگہ تجویز کی تھی وہاں میر بحروں کی بستیاں تھیں۔ کچھ لوگوں نے جگہ کی بجائے حکومت سے روپیہ لے لیا اور زیادہ کمانے کے شوق میں حیدرآباد میں رہائش اختیار کر لی۔

کریمو اور فضل دونوں ہی بچپن سے گہرے دوست تھے۔ دونوں ہی میر بحروں کے بیٹے تھے۔ علم و ہنر سے بے بہرہ۔ شہر میں روزگار ان کے لیے جو ایک مسئلہ بن گیا۔ حکومت سے جو [illegible] ملا تھا اس سے انہوں نے شہر میں مکان بنا لیے تھے اور باقی بچا اس سے دال روٹی چل رہی تھی۔

کریمو فضل سے زیادہ غریب تھا۔ کیوں کہ حکومت نے اُسے معاوضہ بھی کم دیا تھا اور اس کے گھر میں کھانے والوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔

شانو، کریلو کی چھوٹی بہن تھی۔ گاؤں کی آزاد فضا نے اُسے وقت سے پہلے ہی جوان کر دیا تھا، پھر شہر کی ہوا نے اُسے اور بھی پروان چڑھایا۔

وہ جب بھی اپنے بھائی کے دوست فضل کو دیکھتی، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ وہ رفتہ رفتہ فضل سے محبت کرنے لگی۔

فضل اور کریلو کے گھر والے بھی ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اور شہر آنے کے بعد تو اس محبت میں اور بھی شدت آگئی تھی کیونکہ ایک تو شہر کا ماحول بیگانوں جیسا تھا، پھر دکھ سکھ میں ساتھ دینے والا بھی یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ دونوں خاندان اس طرح سے رہتے تھے جیسے ایک ہی گھر کے افراد ہوں۔

فضل اور کریلو ایک دوسرے کے گھر بلا روک ٹوک آیا جایا کرتے تھے لیکن جب سے شانو جوان ہوئی تھی، فضل نے بلا جھجک جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ پہلے دروازے پر کھڑا ہو کر کریلو کو آواز دیتا اور پھر اندر داخل ہوتا کیونکہ وادیٔ مہران کی یہ قدیم روایت تھی کہ اگر گھر میں جوان لڑکی ہے تو سگا بھائی بھی آواز دیئے بغیر نہیں آسکتا۔ پھر فضل اور کریلو تو غیر تھے۔

کچھ پرانی روایات اور کچھ زمانے کے حالات نے دونوں ہی خاندانوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ اب فضل گھر میں کبھی کبھار ہی آتا تھا لیکن شام ہوتے ہی وہ کریلو کے گھر ضرور پہنچ جاتا تھا اور پھر دونوں دوست اپنے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ کر خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتے تھے۔

شانو نے جوانی کے جہنم زار میں قدم رکھ دیا تھا جہاں ارمان شعلوں کی مانند بلند ہوتے ہیں۔ جہاں ہر لڑکی کی آنکھوں میں سرخ ڈورے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے بوڑھے باپ اور نوجوان بھائی کو اس بات کا احساس تھا لیکن وہ مجبور تھے۔ پہلی کے اس پار سے آئے ہوئے انہیں پورے دو سال ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک ذریعۂ معاش میسر نہیں آیا تھا۔ فضل دن میں تین چار روپے کی مزدوری کر کے اپنے گھر کا گزارہ کر رہا تھا لیکن

کریلو کا حال اس سے بُرا تھا۔ دو دو تین تین دن تک اُسے مزدوری نہیں ملتی تھی۔

شانو سے گھریلو حالات پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی کہ باپ بوڑھا ہے اور جوان بھائی کی کمائی اتنی قلیل ہے کہ مشکل سے دو وقت کی روٹی میسر ہوتی ہے۔ ایسے میں اُسے اپنی ماں یاد آتی جو اس کی پیدائش کے سال بھر بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ شانو اپنے حالات کے بارے میں جتنا سوچتی، مایوسی اور غربت کے اندھیرے گہرے ہوتے چلے جاتے۔ اس کے دماغ میں کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا کہ وہ دلہن نہیں بن سکتی۔ اس کے گھر کبھی دولہا نہیں آسکتا۔ اس کے ارمانوں کی سیج یوں ہی سُونی رہے گی۔ پھر... پھر وہ اپنی ہی طرح غریب دولہا کو تلاش کرتی اور گھوم پھر کر نگاہِ انتخاب فضل پر جا کر ٹھہرتی۔

فضل جوان تھا۔ اُسے بھی تو زندگی گزارنے کی خاطر "ساتھی" کی ضرورت تھی لیکن غربت اس کا بھی راستہ روکے کھڑی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شانو اس کے دوست کی بہن ہے لیکن وہ حالات سے مجبور تھا۔

مرد کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ جب وہ محبت کرتا ہے تو صبر نہیں کر سکتا۔

شانو اتنا کہہ کر خلا میں دیکھنے لگی۔ پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی: "اور ہم نے خفیہ طور پر نکاح کر لیا۔ اور جانتے ہو پھر کیا ہوا؟" دوشیزہ نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

"کیا.....؟" میں اس کے اس اچانک سوال سے چونک پڑا۔

"جب آدمی معاشرہ میں رائج قوانین کو توڑتا ہے تو اس کا انجام بھی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ شانو جانتی تھی کہ اس پر جو قیامت آنے والی ہے اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ راز افشا ہوتے ہی نہ صرف اس کی زندگی ختم کر دی جائے گی بلکہ فضل بھی نہیں بچ سکے گا۔

فضل کو بھی کچھ یہی خطرہ لاحق تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن راز ضرور کھل جائے گا۔

لہٰذا اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ اس شہر کو چھوڑ دیا جائے۔

ان دونوں نے دریائے سندھ کے پار سہون شریف میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر ایک رات اجب کہ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے ، ہر طرف اندھیرا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ صبح سے پہلے بارش نہیں ہوگی ، وہ دونوں میاں بیوی گھروں سے نکل پڑے ۔ وہ چاہتے تھے کہ صبح بارش ہونے سے پہلے ہی دریا پار کر لیں ۔ پھر — پھر انہیں کوئی نہیں ڈھونڈ سکے گا ۔ وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس پگ ڈنڈی پر جا رہے تھے جو دریائے سندھ کی طرف جاتی تھی ۔ ابھی وہ یہاں تالاب تک ہی پہنچے تھے کہ اچانک بارش اور ہوا کے طوفان نے ان کا راستہ روک لیا ۔ وہ طوفان بالکل آج ہی جیسا تھا۔"

اتنا کہہ کر دوشیزہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی - باہر بارش اور ہوا کا طوفان پہلے ہی کی طرح جاری تھا۔

"بارش نے ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ کر دی تھی" وہ دوبارہ بولی "چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ دونوں طوفان سے بچنے کی خاطر اس مکان میں آ گئے - ویسے بھی یہ مکان صدیوں سے خالی پڑا تھا ۔ فضل کا خیال تھا کہ ذرا طوفان کم ہو تو سفر دوبارہ شروع کر دیا جائے ۔ لیکن یہ طوفان تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا ۔ بارش کی ٹھنڈی ہوا سے شانو کپکپانے لگی ۔ اس کے کپڑے پہلے ہی بارش میں بھیگ چکے تھے فضل نے اُسے کونے میں بیٹھ جانے کو کہا اور خود لکڑیاں تلاش کرنے چلا گیا۔

"لیکن ایسے طوفان میں اُسے لکڑیاں کہاں سے ملتیں" میں نے پوچھا۔

"یہ طوفان بڑا ہی ظالم ہے" دوشیزہ نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اس طوفان نے ان دونوں کے گھر والوں کو بیدار کر دیا ۔ شانو کے باپ اور بھائی نے اپنے اپنے پلنگ اندر کمرے میں کھینچ لیے ۔ لیکن شانو کا پلنگ ! — وہ تو خالی پڑا تھا"

"رات کی تاریکی میں جوان بیٹی کا پلنگ خالی پڑا ہو تو ماں باپ کی جان نکل جاتی ہے" اس نے ایسے کہا جیسے اپنی بات کی تصدیق چاہتی ہو۔

میں نے اقرار کے انداز میں سر ہلا دیا۔

"اس کے بوڑھے باپ نے بھی پلنگ خالی دیکھا تو کلیجہ تھام لیا" دوشیزہ بولی۔ "لیکن کریمو جوان تھا ۔ اس کی رگوں میں گرم خون دوڑ رہا تھا ۔ اس کے دل میں غم کی جگہ غصّہ نے لے لی ۔ اس نے لب دم باپ کو پلنگ پر لٹایا اور کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی لے کر باہر نکل آیا"

"تم جانتے ہو ؟" اس نے انگلی اٹھا کر پوچھا "گاؤں کے لوگ پیروں کے نشانات دیکھ کر چوروں کا کھوج لگا لیتے ہیں ۔ کریمو بھی بہن کے پیروں کے نشانات دیکھتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا ۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی ۔ شانو کونے میں دبکی بیٹھی تھی ، خوف سے نہیں ، سردی کی وجہ سے ۔ کریمو اس کے سر پر پہنچ گیا ۔ شانو اپنے بھائی کو دیکھ کر فرطِ محبت سے کھڑی ہو گئی"

"اَدا ..... !" شانو محبت سے چلائی ۔ (اَدا سندھی زبان میں بھائی کو کہتے ہیں)

"تیرے ساتھ اور کون ہے ؟" کریمو نے پھولی سانس سے پوچھا۔

"میرا شوہر" شانو نے کپکپاتے ہونٹوں سے جواب دیا۔

"پاؤں کے نشان جھوٹ نہیں بولتے" کریمو غصّہ سے کانپتے ہوئے بولا "وہ ذلیل ... کمینہ کہاں ہے ؟"

"قصور اس کا نہیں ، میرا ہے اَدا ! مجھ سے غلطی ہو گئی ۔ مجھے رسم و رواج کے مطابق شادی کرنی چاہیئے تھی" شانو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ۔ وہ اپنے بھائی کا دل اپنے شوہر کی طرف سے صاف کر دینا چاہتی تھی۔

"بے غیرت" کریمو نے یہ کہہ کر اپنے دائیں ہاتھ کا پورا پنجہ اس کے منہ پر مار دیا ۔ سندھی

معاشرے کے مطابق اس طرح کی حرکت نہ صرف انتہائی اظہارِ نفرت ہوتی ہے بلکہ گالی بھی ہے۔

"مجھے معاف کر دے اُدا!" شانو نے اسی ہی طرح ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا!"

لیکن اب معاف کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ "بے غیرت، تو نے باپ کی عزت کو پامال کیا ہے" کریو غصے سے دھاڑا اور لالٹین نیچے رکھ کر کلہاڑی اس کے سر پر تان لی۔

"اچھا۔ فضل کو بچانے دے" شانو نے موت سامنے دیکھی تو اسے اپنا محبوب شوہر یاد آ گیا، لیکن فضل ـــ یہ نام تو کریو کے لیے گالی تھا۔ اس نے اپنی بہن کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ غصے میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ خاندانی عـــزت کی خاطر بہن کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس نے اپنی بہن کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ فضا میں ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ کلہاڑی شانو کے عین سر کے درمیان میں پیوست ہو گئی۔

"فضل کو بچانے دے!" شانو ایک بار پھر گڑگڑائی۔ انتظار کی شدت نے شانو کے دل سے موت کا خوف نکال دیا تھا۔ اس کے سر سے گاڑھا گاڑھا سرخ خون بہہ بہہ کر چہرہ پر آ رہا تھا۔ اسی لمحے زینے پر آہٹ سنائی دی شاید فضل آ رہا تھا۔ کریو خون آلود کلہاڑی لیے اس طرف دوڑا اور ... اور ... پھر فضل کبھی نہ آ سکا ـــ "کریو نے اسے بھی قتل کر دیا ہوگا!" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن ـــ شانو تو آج بھی اس طوفان میں اس کا انتظار کر رہی ہے!" دوشیزہ نے کرسی کی پشت سے کمر لگاتے ہوئے کہا۔

میں نے غور سے دیکھا۔ دوشیزہ کے سر سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔

"تم ... تم ... شانو ہو!" میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں، میں شانو ہوں جسے اس کے بھائی کریو نے محض غلط فہمی کی بنا پر مار دیا ـــ جسے اپنے محبوب شوہر کا اس طوفان میں ابھی انتظار ہے!" دوشیزہ نے جواب دیا۔

لالٹین کی روشنی میں اس کا خون آلودہ چہرہ بڑا ہی بھیانک لگ رہا تھا۔ خوف سے

میرا بدن کپکپانے لگا۔ لیکن میں نے اپنے حواس پر قابو رکھا۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم ... تم ... کہاں جا رہے ہو؟" شانو نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے زینے کی جانب دوڑ لگائی۔

"میرے فضل کو بھی ڈھونڈ لانا!" دوشیزہ نے بلند آواز سے کہا۔

میں بے تحاشہ تیزی سے زینہ اتر رہا تھا کہ اچانک پاؤں پھسلا۔ شاید کوئی تختہ نکل گیا تھا میں لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

وہ سب کیا تھا

جب مجھے ہوش آیا تو میں مستانی کی کوٹھڑی میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور سفید ریش بزرگ کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ مستانی کونے میں بیٹھی ایلومونیم کی پتیلی سے مٹی کے پیالوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔

"میں کہاں ہوں؟ . . . وہ مکان اور لڑکی کہاں ہے؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"لڑکی؟ — کون سی لڑکی؟" سفید ریش بزرگ نے قدرے تعجب سے پوچھا پھر میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولے "مجھے تو تم معصوم شاہ کلہوڑ کی پہاڑی کے نیچے بے ہوش ملے تھے۔"

"ہاں میں بھاگا تھا اور زینہ سے میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔" میں نے سفید ریش بزرگ کو بتایا۔ اتنے میں مستانی ایک پیالہ میں چائے لے کر آ گئی۔ اس نے پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو چائے پیو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔"

میں نے پیالہ لے لیا اور چائے پینے لگا۔

"رات میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ لیکن تم نہیں آئے۔" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ پھر پلنگ پر بیٹھ کر بولی۔ "تمہارے ساتھ جو واقعہ گزرا ہے، پورا بتا سکتے ہو؟"

میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور چائے ختم کرنے کے بعد شروع سے آخر تک جو کچھ بھی پیش آیا تھا، سنا دیا۔

مستانی نے نہایت توجہ سے واقعہ سنا اور پھر سفید ریش بزرگ سے مخاطب ہوئی۔ "بابا، شانو ابھی تک اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئی۔"

شانو کا نام سنتے ہی میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ "کیا تم اسے جانتی ہو؟" میں نے خوف اور تعجب سے پوچھا لیکن ان دونوں میں سے ایک نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔

"میں اسے کئی مرتبہ تنبیہ کر چکا ہوں لیکن وہ نہ جانے کس طرح حصار سے نکل آتی ہے۔" سفید ریش بزرگ نے بتایا۔

"بابا جی!" مستانی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دراصل اسے حصار سے نکالا جاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں یہ حرکت صرف ایک ہی شخص کر سکتا ہے۔" پھر وہ غصہ میں پلنگ سے کھڑی ہو کر بولی۔ "آخر — یہ سادھو خود کو سمجھتا کیا ہے؟"

مستانی کا انداز جارحانہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی سے لڑنے والی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سفید ریش بزرگ نے نہایت ہی پھرتی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور نہایت ہی شفقت آمیز لہجے میں بولے۔ "میری بیٹی تو بڑی بہادر ہے۔ یہ خبیث کیا بگاڑ سکتا ہے۔ غصہ تو میری بیٹی کو آتا ہی نہیں۔ یہ حرام تو میری بیٹی کے پاس آ ہی نہیں سکتا۔ کیوں بیٹا! میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

سفید ریش بزرگ کے چہرے پر نہایت ہی دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مستانی بھی انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اب اس کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔

"میں شانو کو سمجھا دوں گا۔" یہ کہہ کر سفید ریش بزرگ دروازہ کی جانب بڑھے۔

"نہیں بابا جی! اسے میرے پاس نہ بھیج دیں۔" مستانی نے پُرزور لہجے میں کہا۔

سفید ریش بزرگ نے مسکرا کر دیکھا اور باہر نکل گئے۔

"کیا، کیا تم اسے جانتی ہو؟" میں نے خوف سے پوچھا۔

"ہاں، میں نہ صرف اسے جانتی ہوں بلکہ وہ تو میرے ساتھ ہی یہاں رہتی ہے۔" اس انکشاف سے میں حیرت زدہ ہو گیا۔ "لیکن وہ تو ایک روح ہے۔" میں نے بتایا۔

"میں جانتی ہوں۔" مستانی اسی طرح مسکرا کر بولی۔ "شانو ایک بے چین روح ہے جس کی خواہش کی تکمیل اس کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ وہ آج بھی ماضی سے وابستہ ہے اور اسے جب بھی موقع ملتا ہے، ماضی کا سوانگ رچا کر اپنی تمنا کی تکمیل کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں، اگر موت کے وقت کسی خواہش کی شدت قائم رہے تو بعض دفعہ روح اس خواہش کی تکمیل میں بھٹکتی رہتی ہے۔" مستانی نے بتایا۔ "جب ہی تو مسلمان کے لیے لازم ہے کہ عالم سکرات میں صرف اپنے خدا کو یاد کرے۔"

ابھی مستانی نے اتنا ہی کہا تھا کہ "میں ... آؤں" کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کوٹھڑی کے دروازے پر ایک سفید اور کالے رنگ کی بلی اندر آنے کی منتظر ہے۔

"آجاؤ۔" مستانی نے بلی کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

"یہ شانو ہے۔" مستانی نے مجھے بتایا۔ میں خوف زدہ نظروں سے بلی کو دیکھ رہا تھا۔

بلی یا شانو نہایت ہی خوف زدہ انداز میں میاؤں، میاؤں کرتی اندر داخل ہوئی۔ وہ مستانی کے پاؤں میں لوٹنا چاہتی تھی لیکن مستانی نے اسے نہایت ہی سخت لہجے میں ڈانٹ دیا۔ بلی جہاں تھی وہیں دبک گئی۔

"بتا، ببول کے درخت سے آگے کیوں گئی تھی؟" مستانی نے نہایت ہی

کرخت لہجے میں پوچھا۔

بلی جو کہ زمین پر منہ لٹکائے کھڑی تھی آہستہ سے غوں، غوں کر کے غرائی۔ اس کی یہ غراہٹ لمبی تھی۔ اور اس غراہٹ میں ایک نام صاف سنائی دے رہا تھا... س... و... ک... ھ...

"تیرے سکھ دیو کی ایسی تیسی۔" مستانی نے غصے میں کہا۔ "تو اس کی بات مانے گی یا اس سے پوچھا۔" اور پھر بلی پر نظریں جما دیں۔

میں نے دیکھا خوف سے بلی کے بال کھڑے ہو گئے اس کے حلق سے دبی دبی خرخراہٹ نکل رہی تھی۔ پھر وہ زمین سے تقریباً دو فٹ اوپر اچھلی اور پلٹا کھا کر گری۔ اس پٹخنی سے اسے نہایت زوردار چوٹ لگی۔ وہ نہایت ہی دل سوز آواز میں میاؤں، میاؤں، کرنے لگی۔ جیسے اکثر بلیاں روتے وقت کرتی ہیں۔

"اگر اب تو نے کوئی حرکت کی تو اس سے بھی زیادہ سخت سزا دوں گی۔" مستانی نے انگلی کے اشارے سے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "جا، اب دفع ہو جا۔"

اور یہ سنتے ہی بلی دُم دبا کر بھاگ گئی۔ میں حیران نظروں سے مستانی کو دیکھ رہا تھا وہ میرے قریب آئی اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "خان، یہ کائنات بڑی ہی پر اسرار ہے۔ لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مستانی کے یہ تسلی آمیز جملے میرے دماغ میں اترتے چلے گئے۔ رات والا حادثہ مجھے خواب سا نظر آیا۔ میں نے خود کو پھر پہلے ہی کی طرح تر و تازہ محسوس کیا۔

میں تارک الدنیا ہوگیا

اس واقعہ کے بعد میرا دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔ میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت مستانی کی کوٹھری میں گزارنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے میں بعض دفعہ دفتر سے چھٹی کے بعد سیدھا جیکب تالاب پہنچ جاتا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا جب سورج مغرب کی سمت جھکنا شروع کرتا ہے۔ دنیا سے بیگانگی دیکھتے ہوئے مستانی نے مجھے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ میں جب چاہوں اس کی کوٹھری میں آسکتا تھا۔

میں چھٹی کے بعد جب بھی جیکب تالاب پہنچا مستانی کو غیر موجود پایا۔ کیونکہ وہ دن اور رات کا بیشتر حصہ شہر میں گزارا کرتی تھی۔ البتہ سفید ریش بزرگ جنہیں مستانی احتراماً باباجی کہتی تھی، وہاں موجود رہتے تھے۔

باباجی مجھے چھوڑ کر باہر نکل جاتے۔ میں کوٹھری میں پہنچ کر وضو کرتا۔ اگر وقت ہوتا تو فرض نماز ادا کرتا، نہیں تو نفلوں میں مشغول ہوجاتا۔ شاید پرسکون ماحول کا اثر تھا کہ نماز کے دوران مجھے معلوم ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ مستانی کس وقت آتی ہے۔

نماز میں منہمک دیکھ کر مستانی نے بھی کبھی مجھے اپنی آمد کا احساس نہیں دلایا۔ البتہ جب میں نماز سے فارغ ہوتا تو وہ مجھے پلنگ پر بیٹھی نظر آتی۔ یا پھر دوسرے کونے میں مصلا بچھائے عبادت کرتی نظر آتی۔

مستانی کو باجرہ کی روٹی اور پودینہ کی چٹنی بے انتہا مرغوب تھی۔ شروع میں جب

ایک دو بار اس نے مجھے دعوت دی تو میں نے کمتر غذا سمجھ کر انکار کردیا۔ لیکن جب ایک بار کھالی تو یقین جانیے منہ کو ایسا مزہ لگا کہ کوئی دوسری غذا کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

مستانی کے قریب رہ کر میں نے جو کرامات دیکھیں ان سے میری نظروں میں مستانی کی قدرومنزلت بڑھتی چلی گئی۔ مستانی کا ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنا میرے لیے باعث فخر تھا۔ میں نے خود کو مستانی کی خدمت کے لیے وقف کردیا تھا۔ اس کا معمولی سے معمولی کام کرکے مجھے ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی تھی۔ میں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ رات کے پچھلے پہر جب مستانی پلنگ پر سونے کی خاطر لیٹتی تو میں اس کے سر دباتا یا سر میں تیل کی مالش کرنے لگتا۔

مستانی جو کہ بظاہر پگلی اور حواس باختہ نظر آتی تھی درحقیقت عشق الٰہی کی ایسی منزل پر فائز تھی جہاں پہنچنے کی خاطر عمر عزیز کا بیشتر اور طویل حصہ عبادت و ریاضت میں گزارنا پڑتا ہے۔ یہ سارا کمال اس کے والد صاحب کا تھا۔ یہ بزرگ عمر عزیز کے سو سال پورے کرچکے تھے اور اب اپنی بیٹی کی نگہبانی پر مامور تھے۔ ان محترم بزرگ نے اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت اس طرح سے انجام دی تھی کہ خداوند کریم نے اُسے اپنی بے پناہ نوازشوں سے نواز دیا تھا۔ وہ عارفہ تھی اور کائنات میں اُسے تصرف حاصل تھا۔

مستانی کی قلندرانہ تربیت کی وجہ سے میں ملازمت چھوڑ چکا تھا۔ جہاں تک گھر کا تعلق تھا وہاں صرف میرا ایک باپ تھا۔ وہ بھی کسی بیوہ کے چکر میں پڑ کر اسی کا ہوگیا تھا۔ اب اس دنیا میں ساتھی، میرا مونس و غمخوار جو کچھ بھی تھا وہ مستانی کی ذات تھی۔ میں نے کلی طور سے خود کو مستانی کے سپرد کردیا تھا۔ اور مستانی نے بھی مجھے راہ حق کا مسافر بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس نے مجھ پر نگاہِ کرم نہیں ڈالی تھی۔ بس، میں خود ہی کثرت سے نفلیں ادا کرنے لگا تھا۔ البتہ وہ مجھے ہمیشہ نفس پر قابو پانے کی نصیحت کرتی تھی۔

باباجی رات کو بھی کوٹھری کے باہر رہتے تھے۔ میں انہیں دن میں کبھی کبھی مستانی کی غیر موجودگی میں کوٹھری کے اندر ضرورت کی کوئی چیز لینے کی خاطر آتے دیکھتا تھا۔ ورنہ وہ

سارا وقت کوٹھری کے باہر ہوٹل کے ایک درخت کے نیچے گزارتے تھے۔

مستانی مجھ سے بہت ہی کم بات کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کبھی بھی کوئی فالتو بات نہیں کی۔ کبھی کبھی وہ شہر میں گزرے ہوئے کسی خاص واقعہ کا ذکر کرتی اور میرے نفس کا جائزہ لیتی۔ میں بھی اس سے بہت کم بات کرتا تھا۔ اور میرے پاس تو ویسے بھی کوئی موضوع نہیں تھا کیونکہ مجھے شہر سے نکلے ہوئے کئی ماہ و سال گزر چکے تھے۔

میرا لباس بوسیدہ ہو چلا تھا۔ سر کے بال اور داڑھی بے انتہا بڑھ چکی تھی۔

جب میرا دل چاہتا تالاب کے کنارے لباس پہنے ہی پہنے نہا لیا کرتا تھا۔

اس طرح تقریباً دو ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن مستانی مجھ سے بولی۔

"میاں! کامل یکسوئی کے لیے تم "اللہ ہو" کا ورد کیا کرو۔ شاید تم نے دیکھا ہوگا کہ مائیں بچوں کو سلانے کی خاطر "اللہ ہو، اللہ ہو" کا ورد کرتی ہیں۔ اور بے چین بچہ اس ورد کے اثر سے بہت جلد مکمل سکون کے ساتھ سو جاتا ہے۔ اس نام کی برکت سے ہر شے کو قرار آجاتا ہے تمہارا بھی منتشر ذہن جم جائے گا خیالات کی یلغار رک جائے گی۔ تمہاری سوچ بدل جائے گی۔

مستانی نے مجھے طریقہ بتایا اور میں اس کے بتائے ہوئے طریقے پر بیٹھ کر "اللہ ہو" کا ورد کرنے لگا۔

کچھ ہی دنوں بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس ورد کے شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد حرکت پذیر اشیاء ساکن ہونے لگتی ہیں۔ پھر جوں جوں دن گزرتے گئے اس ورد کی تاثیر نمایاں ہوتی چلی گئی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ اللہ ہو کے ورد کے ساتھ ہی تمام اشیاء ساکن ہو جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ ہلتے ہوئے درخت اور چلتی ہوئی بلیاں بھی رک جاتی تھیں۔

میرے دماغ کے ہر گوشے میں یہی آواز سما جاتی تھی۔ پھر ... پھر میرے ذہن میں کوئی اور تصور نہیں ہوتا تھا۔ اللہ ہو کی اس حیرت انگیز تاثیر سے میں نہ صرف حیرت زدہ

تھا بلکہ خوش بھی تھا۔

اس کی تاثیر کو مزید نمایاں کرنے کی خاطر میں زیادہ سے زیادہ، وقت بے وقت جب دل چاہتا اللہ ہو اللہ ہو کرنے لگتا۔ کبھی کبھی میں کوٹھری کے باہر بھی آجاتا اور کسی درخت یا جھاڑی کے سائے میں بیٹھ کر اللہ ہو کی ضربیں لگانا شروع کر دیتا۔ بعض دفعہ اڑتے ہوئے پرندے بھی دم سادھ کر بیٹھ جاتے جیسے ان میں جان نہ ہو۔ اس دوران مجھے اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ میں ماحول سے بالکل ہی بے خبر ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا "اللہ ہو" کی ضربیں لگا رہا تھا۔ پرندے میرے سامنے زمین پر دم سادھے بیٹھے تھے۔ ہر شے ساکت تھی کہ اچانک مجھے اپنی آواز گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ جبڑا کھنچنے لگا۔ اور پھر آواز بیٹھتی چلی گئی۔ اس صورت حال سے میں سخت پریشان ہو گیا۔ ابھی میں کچھ سوچنے سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک ننگ دھڑنگ شخص بھبوت ملے میرے سامنے نمودار ہو گیا۔ میں حیران کن نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ شخص کہاں سے اور کیوں آ گیا۔

سکھ دیو

اس کی عمر مشکل سے پینتیس چالیس سال ہوگی۔ جسم نہایت ہی گٹھا ہوا۔ سر کے تمام بال کٹے ہوئے۔ صرف سر کے درمیان میں بالوں کی ایک موٹی سی لٹ تھی جو کر خم کھاتی ہوئی پیچھے کی جانب چلی گئی تھی۔ پیشانی پر تین سُرخ لکیریں نمایاں تھیں۔ اس کے پورے جسم پر صرف ایک سُرخ رنگ کی لنگوٹ تھی۔ گلے میں موتیوں کی لمبی سی مالا پڑی ہوئی تھی اور ایک ایسی ہی مالا اس کے دائیں ہاتھ میں بھی تھی جس کے دانوں پر اس کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں۔

"کہو، مہاراج کیا حال ہے؟" اس نے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔

اس کی بات کا جواب دینے کے لیے میں نے منہ کھولنا چاہا۔ لیکن میرا منہ بند تھا۔ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پرندے اپنی جگہ سے اُڑ گئے اور درخت زور زور سے ہلنے لگے۔ میری ناکامی پر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کیا بات ہے مہاراج، آپ بول نہیں رہے؟"

اس کے اس طنز پر میں تلملا کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، مجھے سفید ریش بزرگ دکھائی دیئے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "سید ھارے مہاراج پدھاریے۔ آج آپ ادھر کیسے نکل آئے؟"

"آیا تو میں آپ ہی سے ملنے تھا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "لیکن اس بالک کی شرارت دیکھ کر رُک گیا۔ پرندوں کو ستا رہا تھا۔"

ابھی بچہ ہے۔ آپ کی سرزنش ہی کافی ہے۔" سفید ریش بزرگ نے مسکرا کر جواب دیا۔ اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے آستانے کی طرف چل دیے۔

اور میری قوت گویائی لوٹ آئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں سہما سہما اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ ہی فاصلہ پر ببول کے درخت کے نیچے کھڑا سفید ریش بزرگ سے کہہ رہا تھا۔ "بابا جی! آپ جانتے ہیں کہ اس دھرتی پر میری شکتی وان جیسا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے آپ سے پریم ہے۔۔۔۔ بے انتہا پریم۔

"بھئی، ہمیں تمہاری دوستی اور محبت کا اعتراف ہے۔" سفید ریش بزرگ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر۔۔۔۔ اس دوستی کو پریم کے بندھن سے جیون بھر کے لیے اٹوٹ کر لیجئے نا۔" اس نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

"سکھو!" بابا جی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ اس معاملہ میں مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔"

"تم بھگوان کے کیسے سیوک ہو!" سکھ دیو نے زبردست طنز کیا۔ "تمہیں اپنی بیٹی پر اختیار نہیں۔"

"اس دنیا میں کسی کو کسی پر اختیار نہیں ہے۔" بابا جی نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔ "مختارِ کل تو صرف ایک ہی ذات ہے۔ انسان تو پھر بھی اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کو اپنی مرضی کے مطابق پورا کرنے کا حق رکھتا ہے۔"

"لیکن۔۔۔۔ اُسے یہ حق کس نے دیا؟" سکھ دیو نے برجستہ پوچھا۔

"اللہ نے۔" بابا جی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" سکھ دیو کھسیانا ہو کر بولا۔

"آپ کو اپنی بیٹی پر تو اختیار حاصل ہے۔"

"اگر مجھے اختیار حاصل ہوتا تو تمہیں اتنی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔" باباجی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہر انسان اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

"میں تو صرف یہ چاہتا ہوں۔" سکھ دیو سوچ کر بولا۔ "کہ دو طاقتیں ایک ہو جائیں تو اچھا ہے۔"

"اگر اللہ کو یہ منظور ہے تو ایسا ضرور ہو جائے گا۔" باباجی نے دائیں ہاتھ کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ "اور اگر اس کو منظور نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"یہ چھوکرا کون ہے؟" اچانک سکھ دیو نے میرے بارے میں پوچھا۔

"اللہ کا بندہ ہے۔" باباجی نے حسب عادت مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے، اس جگہ اس کا کیا کام؟" سکھ دیو نے قدرے تجسس سے پوچھا۔

"یہ زمین اللہ کی ہے۔ اس پر ہر جاندار کو چلنے پھرنے کا حق ہے۔" باباجی نے جواب دیا۔

"گیانی معلوم ہوتا ہے۔" سکھ دیو پیشانی پر لکیریں ڈال کر بولا۔ پھر قدرے پریشانی سے پوچھا۔ "آپ کا چیلا تو نہیں ہے؟"

"میرا چیلا تو صرف تم ہو۔" باباجی نے رُوکھے لہجے میں کہا۔

"جب ہی تو میں آپ کے چرنوں میں جیون گزارنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باباجی کے پیروں میں جھک گیا۔

لیکن باباجی نے فوراً اسے کاندھوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑے کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں مجھے گنہگار کرتے ہو؟"

"آپ مجھے نراش کر رہے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز سے بولا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ

قدم نہ چھونے پر شکایت کر رہا ہے حالانکہ اس کا مطلب کچھ اور تھا۔

"یہ محض تمہارا خیال ہے سکھ دیو۔" باباجی نے اسے سمجھایا۔ "تم نے مجھ سے جس چیز کی تمنا کی ہے وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

سکھ دیو نے اس بات کے جواب میں دو تین بار اپنے سر کو اقرار کے انداز میں ہلایا جیسے باباجی کی بات کی تائید کر رہا ہو۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل دیا۔ اس کا رُخ معصوم شاہ ٹکھوڑا کی پہاڑی کی طرف تھا۔

رات کو جب مستانی آئی تو میں نے اس سے سکھ دیو کا تذکرہ کیا لیکن مستانی نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاید باباجی نے اسے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔

مستانی نے مجھ سے کہا۔ "خان! اس دنیا میں باطل قوتیں بھی ہیں جو کمزور انسانوں کو ستاتی رہتی ہیں۔ ان کا تدارک کرنا اللہ کے محبوب بندوں کا کام ہے۔"

"لیکن، یہ سکھ دیو کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟" مستانی نے میرے الفاظ کو دوہرایا پھر لاپروائی سے بولی۔ "یہ وہی ہے جس نے تمہاری خالہ زاد بہن پر شوہان کو مسلط کر دیا تھا۔"

یہ سن کر میں چونک گیا۔ ماضی کا پورا واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اور.... اس کے ساتھ ہی میرے دل پر سکھ دیو کی پُراسرار شیطانی طاقت کا رُعب سا چھا گیا۔ میرے سامنے دن والے سکھ دیو کی شکل ابھر آئی جس نے میری قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔

میں سکھ دیو کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، اس کا رُعب مجھ پر غالب آتا جاتا تھا۔ درحقیقت مستانی تک پہنچنے کا باعث بھی اسی سکھ دیو کی حرکت تھی۔ اس نے میری خالہ زاد بہن پر ایک بدرُوح کو مسلط کر دیا تھا۔ اتفاقاً میری ملاقات مستانی سے ہو گئی۔ اس نے میری بہن کو اس بدرُوح سے نجات دلا دی تھی۔ اور پھر میں بھی روحوں کو تابع کرنے کے شوق میں مستانی کو تلاش کرتا ہوا اس تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن یہاں پہنچ کر میں اپنا مقصد بھول گیا۔ اور مستانی کا بے دام

غلام بن کر رہ گیا تھا۔ اب جب کہ مستانی نے یہ انکشاف کیا کہ یہ وہی سکھ دیو ہے تو میرا سویا ہوا شوق ایک بار پھر جاگ اٹھا۔

میں نے بے قراری سے مستانی کو مخاطب کیا۔ "تم جانتی ہو.... میں تم تک . . ."

"ہاں میں جانتی ہوں۔" مستانی نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن یاد رکھو، خاں! ہم سب منشائے الٰہی کے تابع ہیں۔ ہم اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔"

"لیکن یہ سکھ دیو سب کچھ کر سکتا ہے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"سکھ دیو۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ "وہ بھی خدا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا" پھر وہ خلاء میں گھورتی ہوئی بولی۔ "وہ اپنی تقدیر کا لکھا ہوا پورا کر رہا ہے۔"

"میں بھی اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی اپنی تقدیر بدلنا چاہتا ہوں۔" میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

میری بات سن کر مستانی زور سے ہنسی۔ اور پھر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "تقدیر اس طرح نہیں بدلا کرتی۔"

"تم... تم... مجھے روحوں کو تابع کرنا سکھا دو۔ پھر میں خود ہی سب کچھ کر لوں گا۔" میں نے اسی طرح ضد سے کہا۔

"روحوں کو تابع کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔" مستانی نے مجھے سمجھایا۔ "لیکن پہلے تم اپنی روح کا عرفان تو حاصل کر لو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میری روح میرے قابو میں نہیں ہے؟"

"ہاں، تمہاری روح تمہارے قابو میں نہیں ہے۔"

مستانی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "تم اپنے جسم کے تابع ہو۔ اور تمہارا جسم تمہاری روح کا لباس ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "روح تو جسم کے اندر رہتی ہے۔"

"اگر تمہاری بات کو صحیح مان لیا جائے۔" وہ بولی۔ "تو پھر یہ بتاؤ سکھ دیو تمہارے سامنے اچانک کیسے آگیا، کیا تم نے اُسے کسی راستہ سے آتے دیکھا تھا؟"

میں نے نفی کے انداز میں گردن ہلا دی۔

"اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ اسے اپنی روح پر قابو حاصل ہے۔" مستانی نے مجھے سمجھایا۔ "وہ جب چاہے جہاں چاہے، جا سکتا ہے۔"

روح کی پاکیزگی

مستانی کے اس انکشاف نے مجھے مزید حیرت زدہ کر دیا۔ میں اپنے چندر سکھ دیو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "پھر مجھے بتاؤ میں کس طرح اپنی روح سے کام لے سکتا ہوں؟" میں نے بڑے ہی جوش سے پوچھا۔

"اس لیے ضروری ہے کہ پہلے خود کو دھو کر صاف کر لیا جائے۔" مستانی بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"جس طرح مادی چیزوں پر میل چڑھ جاتا ہے، اور وہ اس کی وجہ سے بھاری ہو جاتی ہیں، یہی حال روح کا ہے۔" مستانی نے بتایا۔ "جب تک اسے بھی دھو لیا جائے وہ بھاری رہتی ہے۔ اور بندے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ گوشت پوست کا جسم روح کا لباس ہے۔ ایسا لباس جس کو بندہ جب چاہے تبدیل کر سکتا ہے۔"

"اور... دھلنے کے بعد روح ہلکی ہو جاتی ہے؟" میں نے شش و پنج سے کہا۔

"ہاں، دھلنے کے بعد روح ہلکی ہو جاتی ہے۔" مستانی نے میری تائید کی۔ "اور جب چاہے وہ لباس اتار کر جہاں اس کا دل چاہے جا سکتی ہے۔"

"لیکن اسے دھونے کا طریقہ کیا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

مستانی نے سنجیدگی سے کہا: "حق تعالیٰ کو عجز و انکساری حد درجہ پسند ہے۔ جب کوئی بندہ اس کے حضور میں عجز و انکساری سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے تو اس کا رحم نازل ہوتا

ہے اور بندے کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ توبہ گناہوں کو اس طرح دھوتی ہے جس طرح میل کو صابن کاٹ دیتا ہے۔" پھر وہ بڑے انداز سے بولی: "میرا محبوب توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔"

"اس کا طریقہ کیا ہے؟" میں نے اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا طریقہ..." مستانی نے بڑے طریقے سے کہنا شروع کیا: "جب تمہیں اللہ ھو کے ورد کے ساتھ کامل یکسوئی حاصل ہو جائے تو حق تعالیٰ کے حضور میں سجدہ شکر ادا کرو۔ اس کے بعد گڑگڑا کر معافی کی التجا کرو۔ اس طرح سے نفس صاف اور روح پاک ہو جاتی ہے۔"

"لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ توبہ قبول کر لی گئی ہے۔ غلطیوں کو معاف کر دیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خان! تمہیں ہر بات کی جستجو رہتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی پھر سمجھاتے ہوئے کہنے لگی: "جب تمہارا نفس پاک ہو جائے گا، روح منور ہو جائے گی تو وجود الٰہی کا احساس ہوگا۔ اور یہی تمہاری توبہ قبول ہونے کی نشانی ہوگی۔"

اتنا کہہ کر مستانی چلی گئی۔ میں بڑی دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اور پھر... پھر... اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو کا ورد میری زبان پر جاری ہو گیا۔

مستانی نے مجھے جس خاص طریقے سے اللہ ھو کا ورد کرنے اور سجدہ شکر بجا لانے کو کہا تھا، میں نے اس طریقہ پر عمل کیا۔ یقین جانیے رات کے سناٹے میں جب اللہ ھو کا ورد کرتا تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں خالق مطلق کے حضور میں سجدہ ریز ہوں۔ اور اس کیفیت..... اس حالت میں مجھے اپنا ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ وجود باری تعالیٰ کا احساس ہوتے ہی میں اور زیادہ تیزی سے اور زیادہ جوش سے اس کے نام کی گردان شروع کر دیتا۔ اس طرح سے مزید ڈیڑھ دو سال کا عرصہ اور گزر گیا۔

ایک دن جب کہ میں تالاب کے کنارے اللہ ھو کا ورد کر رہا تھا تو میرے سامنے مستانی

کو موجود پایا۔ وہ تحسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی: "خان! یوں تو حق تعالیٰ تک پہنچنے کی کسی مستاد رش کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے محبوب سرورِ انس و جاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو جو درجہ حاصل ہے اس کے سامنے کسی بھی شے کو وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو عشقِ رسول کو حاصل ہے۔"

"یعنی، عبادت کو بھی!" میں نے پوچھا۔

"عبادتِ الٰہی کیا ہے!" اس نے مجھ سے سوال کیا پھر خود ہی بولی: "دراصل عشقِ رسول ہی عبادتِ الٰہی کی بنیاد ہے۔ عشقِ رسول سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان صرف ان کے نام کی مالا جپا کریں۔"

"تو پھر!" میں نے سوالاً کہا۔

"عاشق اور سچے عاشق کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ہر حکم کو بلا تامل بجا لائے" مستانی نے بتایا: "اس کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے تعمیلِ حکم کرے۔ عاشقِ رسول کا فرض ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کو پورا کرے اور احکامِ الٰہی قرآن میں موجود ہیں۔"

"یہ تو شریعت کی بات ہوئی۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں کہیں شرعی حدود سے باہر نہیں رہنے دینا چاہتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی: "میں چاہتی ہوں کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کا پابند ہو جائے۔ یاد رکھو!" وہ حسبِ عادت انگلی اٹھا کر بولی: "جب تک تم مذہب کا پورا لباس زیبِ تن نہیں کرو گے تم کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔"

"مجھے شریعت کا علم نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں دنیا پہلے ہی چھوڑ چکا ہوں۔"

"جو لوگ دین کی خاطر خود کو وقف کر دیتے ہیں، جو لوگ اصحابِ صفہ کی پیروی کرتے ہیں وہی لوگ عارف کہلاتے ہیں۔" مستانی ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ سے بولی۔

"میں نے اصحابِ صفہ کی پیروی کہاں تک کی ہے، مجھے معلوم نہیں۔ دین کیا ہے اور کیا چاہتا ہے، مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"علم۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی: "علم کسی چیز کی حقیقت جاننے کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا باطن اس کی حقیقت اور اصلیت ہوتی ہے۔ جو کہ ظاہر پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور دین کا باطن عارف کے سینے میں ہوتا ہے۔" "اس کا مطلب ہے عارف دین کے باطن سے آگاہ ہوتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔ بالکل۔" وہ پیشانی پر آئی بالوں کی ایک لٹ کو ہٹا کر بولی: "دین کا ظاہری علم کتابوں میں ہوتا ہے جسے پڑھنے کے لیے آنکھیں اور زبان چاہیے۔ جب کہ دین کے باطنی علم کے لیے دل کی بصیرت اور روح کا ادراک چاہیے۔"

دین کے بارے میں مستانی کی بصیرت افروز باتیں سن کر میرے دل میں بھی دین کا باطن جاننے کا شوق ہوا اور اس ہی شوق کے تحت میں بولا: "تو پھر آپ مجھے دین کے باطنی علم سے آگاہ کرو۔"

"اس کے لیے استادِ کامل ہونا ضروری ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا: "استادِ کامل کی راہبری سے منزل آسان ہو جاتی ہے۔"

"لیکن ایسا استادِ کامل ملے گا کہاں، اس کی پہچان کیا ہے!" میں نے پوچھا۔

اور میرے اس معصومانہ سوال پر وہ زور سے ہنس کر بولی: "دینِ فطرت کو باطنی نگاہ سے دیکھنے والوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ خود میں مگن رہتے ہیں لیکن اگر کوئی ان سے رہبری حاصل کرنا چاہے تو وہ دنیائے وحدت کی جلوہ گری دکھانے کی خاطر خود بے حجاب ہو جاتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی بالوں کی وہی لٹ دوبارہ اس کی پیشانی پر آ گئی۔ میں نے غیر ارادی طور سے ہاتھ آگے بڑھایا اور... اور نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میرا ہاتھ اس کی پیشانی پر جا کر رک گیا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ مستانی مجھے بظاہر جو اس باختہ اور معمولی شکل و صورت کی نظر آتی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن کی مثال دنیا کی حسین سے حسین شے سے بھی نہیں دی جا سکتی۔ اور شاید یہ اس کے لافانی حسن ہی کا سحر تھا کہ میں محوِ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

میرے دل میں شدت سے اسے چاہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

مستانی نے میرا ہاتھ پیشانی سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "خان! یہ نفس بڑا ہی ظالم ہے۔ حق تعالےٰ تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی نفس ہے جب تک انسان اسے قابو نہیں کرتا، اس کا شکار رہتا ہے۔"

مستانی کی بات سن کر میں نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔

"عارف بننے کے لیے پہلے اپنے نفس کو جاننا پڑتا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔ "جو لوگ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہی حق تعالےٰ کے برگزیدہ بندے کہلاتے ہیں۔" مستانی نے کہا اور کوٹھری میں چلی گئی۔ میں اپنی حرکت پر شرمندہ تھا اور اپنے نفس کی سرکشی پر نادم۔

حقیقت یہ ہے کہ مستانی اوّل دن سے ہی مجھے پسند تھی اور مستانی اوّل سے ہی مجھے جہاں اور باتوں کی ترغیب دیتی تھی، وہیں نفس کی بھول بھلیوں سے آزاد ہونے کا درس بھی دیتی تھی۔ اگر میں اپنے نفس کی کیفیت بیان کر دوں تو اس داستان کو پڑھنے والوں کی ساری دلچسپی یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ جوں جوں یہ داستان آگے بڑھتی جائے گی میری نفسیاتی کیفیت بھی سامنے آتی جائے گی۔ یوں سمجھیے کہ نفس اور اس داستان کا چولی دامن کا ساتھ ہے بہر حال دوسرے دن صبح ہی صبح جب میں تالاب کے کنارے بیٹھا ہاتھ منہ دھو رہا تھا، مستانی بھی قریب ہی بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ اچانک بولی۔ "دیکھو! وہ کیا ہے؟"

میں نے دیکھا تالاب کی سطح پر ہاتھی سے زیادہ قوی ہیکل ایک جانور کھڑا ہے جو ہم دونوں کی جانب خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ... یہ... یہاں کیسے آگیا!" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ تو ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے۔" مستانی نے جواب دیا۔ "یہ تیرا نفس ہے خان، جو آج بھی تیرے ساتھ ہی ہے لیکن یہ اللہ ہو کی برکت ہے کہ تو نے اسے قابو میں کرنا سیکھ لیا

ہے۔"

"میرا نفس...!" میں اس ہشت پا پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔ اور پھر وہ ہیبت ناک جانور آہستہ آہستہ تالاب کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔

"یہ نفس ہی شیطان ہے خان۔" مستانی اپنے بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی بولی۔ "جو کہ خاک کے پتلے کو خاک ہی میں ملانے کے درپے رہتا ہے لیکن جو اس پر قابو پا لیتا ہے اسے خدا کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اور جو خدا کے منظورِ نظر ہوتے ہیں لامحدود طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں۔"

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"طاقت سب سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہے۔ اور روحانی ہتھیار کے سامنے مادی ہتھیار ہیچ ہیں لیکن حق تعالےٰ اپنے منظورِ نظر بندوں کو یہ طاقت صرف اس کے احکام کی تعمیل بجا لانے کے لیے استعمال کرنے کا اختیار دیتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھ گیا۔

"اُدھر اونچائی کی طرف دیکھ۔" اس نے معصوم شاہ گھوڑا کے مقبرہ والی پہاڑی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس دنیا میں جہاں انسان بستے ہیں، جہاں سے تو آیا ہے جہاں میں ہر روز جاتی ہوں وہ دنیا فانی ہے، وہ دنیا مادی ہے لیکن اس دنیا کی حرص و طمع میں انسان کا کاندھے سے کاندھا چھل رہا ہے۔ یہ انسان جو گروہ در گروہ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ سب فانی شئے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔" پھر وہ سانس لینے کو رکی اور دوبارہ بولی۔ "اگر اس دوڑ میں کوئی دوسرا ان کی راہ میں آ جائے تو یہ انجام سے بے خبر ہو کر اسے روند ڈالتے ہیں یہ سب ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔"

میں کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے گردن جھکائے سنتا رہا۔

"میں روز شہر جاتی ہوں۔" وہ نیم کے چھوٹے سے درخت کے نیچے کھڑے

ہوکر بولی: "اس کائنات کے خالق کا یہی حکم ہے۔ میرے محبوب کی یہی مرضی ہے کہ میں اس شہر کے مظلوموں کی مدد کروں۔ تو نہیں جانتا خان" وہ سرد آہ بھر کر بولی: "میری آنکھیں ہر روز کیسے کیسے ظلم اور کیسی کیسی ناانصافیاں دیکھتی ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رُکی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔ شاید اس کا دل بھر آیا تھا۔

پھر اس نے نیم کے درخت سے ایک شاخ توڑی اور اس کے پتے چباتی ہوئی بولی: "میں دن بھر یہ پتے کھا کر گزارہ کرتی ہوں اس لیے کہ مجھے ان میں سے کسی کی روزی حلال نظر نہیں آتی۔ بیوپاری ملاوٹ کر کے ناقص مال فروخت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دکاندار جھوٹ بول کر دولت کے انبار لگانے میں مصروف ہیں۔ ملازم پیشہ دیانت داری سے اپنی خدمات انجام نہیں دیتے۔ وہ جس جگہ محنت کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں اس ہی ذریعۂ رزق کو نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ سب نفس کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ نفس کی دنیا ہے۔"

"ہاں، وہ نفس کی دنیا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"ایک دنیا وہ ہے جہاں نفس کی ہنگامہ آرائیاں ہیں۔" وہ بولی: "اور ایک دنیا یہ ہے جہاں کوئی ہنگامہ نہیں، سکون ہی سکون ہے۔"

"اس دنیا کا اُس دنیا سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے خان۔" مستانی نے مسکرا کر کہا: "یہ دنیا میرے محبوب کی دنیا ہے اور اس دنیا میں رہنے والے اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔" پھر گہری سوچ میں بولی: "مجھے اپنے محبوب کی ہر بات ماننا ہے، اس کے ہر حکم کو پورا کرنا ہے اور اس کا یہ حکم ہے کہ....."

اتنا کہہ کر وہ نیم کی شاخ سے زمین کریدنے لگی۔

میں کچھ دیر اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بولا: "میں نہیں جانتا کہ تم کس علم کی بات کر رہی ہو۔ میں شریعت اور طریقت کے علم کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں۔"

"تو نے سکھ دیو کو دیکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلا دی۔

"وہ... مجھ سے شادی.... کرنا... چاہتا ہے۔" مستانی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

حیا کی سُرخی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ سکھ دیو کا نام سنتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ پھر مستانی کے اس انکشاف سے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، میرے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔

سکھ دیو کی اچانک آمد اور ببول کے درخت کے نیچے باباجی سے اس کی گفتگو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

رقابت کی آگ ایک دم جل اٹھی۔ میرے ہوتے ہوئے اس دُرِ نایاب کو کون حاصل کر سکتا ہے۔ مستانی میری اور صرف میری ہے۔

نفس نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور میں غصہ سے بولا: "سکھ دیو کی یہ مجال اس گستاخ کی یہ جرأت وہ.... ہرگز ہرگز تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" مستانی نے اس ہی طرح گردن جھکائے ہوئے پوچھا۔

کیوں ــــ اور اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں چند لمحہ سوچتا رہا کہ مستانی کو کیا جواب دوں۔ بالآخر میں نے ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے کہا: "اس لیے کہ تم میری مشعلِ راہ ہو۔"

"پسند تو مجھے سکھ دیو بھی کرتا ہے۔" مستانی نے گردن اٹھا کر کہا۔

ایک بار پھر میں لاجواب ہو گیا۔ مستانی کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ آخر مستانی کا مطلب کیا ہے؟

"خان!" وہ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر بولی: "کسی کو چاہنے کا ہر کسی کو حق ہے۔ اگر آج تم

مجھ پر اجارہ داری دکھا سکے ہو تو کل تم خدا کو بھی اپنا دی بھول گئے اور پھر تم ہر شئے پر قبضہ کرتے چلے جاؤ گے۔"

مستانی کی بات سن کر میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اس نے بڑی ہی سچی، بڑی ہی گہری بات کہی تھی۔ ہوس گیری کی مثال شاید ہی اس سے اچھی کوئی اور ہو۔

"یہی نفس ہے خان۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تمہیں اپنے نفس پر قابو ہوتا تو کہہ سکتے ہو کہ تمہاری مرضی۔ اس نفس کو اپنے قابو میں کرو خان!"

مستانی نے آخری جملہ کہا اور نیم کی شاخ میری طرف اچھال کر تیزی سے کوٹھری کے اندر چلی گئی۔

میں نیم کے نیچے کھڑا اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ مستانی کی باتیں، مستانی کی شخصیت سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پھر میں نے بے خیالی میں ہاتھ میں پکڑی ہوئی شاخ سے دو تین پتے توڑے اور منہ میں ڈال لیے۔ نیم کڑوا ہوتا ہے اس کے پتوں کو بھی کڑوا ہی ہونا چاہیئے لیکن۔ نہیں، یہ پتے تو میٹھے تھے۔

میں کبھی ہاتھ میں پکڑی ہوئی شاخ کو اور اس کے پتوں کو دیکھتا اور کبھی اس نیم کو دیکھتا جس کے نیچے مستانی کھڑی تھی۔!

مستانی کا منشا کیا تھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں اپنے نفس پر قابو حاصل کروں۔

میرا نفس

مستانی کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اس عرصہ میں کبھی کبھی اس حسین و جمیل دوشیزہ کو چاہنے کی خواہش شدت سے پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن — میں فوراً ہی اپنے نفس پر قابو پا لیتا اور سفلی جذبات کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ لیکن اب سکھ دیو میرے دماغ میں ایک رقیب کی حیثیت سے سما چکا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ اس ویرانے میں باباجی کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں ہے۔ لیکن مستانی کے اس انکشاف نے کہ سکھ دیو اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، مجھے نہ صرف تیسرے شخص کی موجودگی کا احساس دلا دیا تھا بلکہ رقابت کی آگ میں جھونک دیا تھا۔ حالانکہ اس طویل مدت میں صرف ایک بار ہی میں نے سکھ دیو کو دیکھا تھا، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحہ کسی بھی وقت آ جائے گا اور مستانی کو لے جائے گا۔

سکھ دیو کی یہ برتری اور مستانی سے جدائی کا تصور میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

اب بجائے اس کے کہ مستانی کی ہدایت کے مطابق اپنے نفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا، میں خود ہی نفس کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ سکھ دیو کب آتا ہے۔ مجھے شدت سے سکھ دیو کا انتظار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آ جائے تو اس سے دو ٹوک بات کر لی جائے۔

اس ہی دماغی خلفشار میں اللہ ہو کے ورد سے میں غافل ہوتا چلا گیا۔ اب میرا دل ذکرِ الٰہی کرنے کو نہیں چاہتا تھا اور اگر کبھی بادلِ نخواستہ کر دیتا شروع بھی کر دیتا تو سکھ دیو کی شکل سامنے

اُجاتی۔ اور پھر میری توجہ ہٹ جاتی۔

اب میں زیادہ سے زیادہ مستانی کی خدمت کرنے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس طریقہ سے اس کے دل میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مقام پیدا کر لوں گا۔ اور جب کبھی انتخابات کا موقع آیا تو مستانی مجھے سکہ دیو پر ترجیح دے گی۔

مستانی میری اس خدمت گزاری سے خوش تھی یا نہیں مجھے اس کا علم نہیں کیونکہ مستانی کا رویہ تو بھی میرے ساتھ پہلے دن جیسا ہی تھا۔

اللہ ہو کا در چھوڑے مجھے کئی ماہ گزر چکے تھے لیکن مستانی نے مجھے کبھی نہیں ٹوکا، البتہ نماز میں کوتاہی پر وہ ضرور ٹوکتی تھی اور اب، میری نماز بھی اس کی خوشی کی خاطر ہوتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ میں اس کو خوش کرنے کے لیے نماز ادا کرتا تھا۔

میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ مستانی جب سونے کی خاطر پلنگ پر لیٹتی تو اس کے سرہانے زمین پر بیٹھ کر اس کے سر میں تیل کی مالش کرنے لگتا۔ اور جب تک وہ سو نہیں جاتی اپنی جگہ سے نہیں اٹھتا۔

ایک ایسی ہی رات کا واقعہ ہے جب کہ میں مستانی کے سر میں تیل کی مالش کر رہا تھا اور رات دبے پاؤں اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

مستانی کی یہ عادت تھی کہ وہ سوتے میں بھی "حق اللہ" کی صدا لگاتی رہتی تھی۔ اس کے سینے کے زیر و بم کے ساتھ ہی حق اللہ، حق اللہ کی مدہم آواز ابھرتی رہتی تھی۔

حق اللہ کی آواز اور سونے کی کیفیت سے میں آگاہ تھا کہ میں جانتا تھا کہ جب وہ سو جاتی ہے تو حق اللہ کی صدا میں معمولی سا ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں ابھی اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ... کہ اچانک مستانی نے زور سے حق اللہ کا نعرہ لگایا۔ یہ نعرہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ میں گھبرا کر رہ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے سر پر جہاں تھے وہیں رک گئے۔

میں نے مستانی کو پہلے کبھی بھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا بری طرح سے

پریشان ہوگیا۔ غیظ و غضب سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

چند لمحے بعد وہ غصہ سے بولی "لعنت ہو تجھ پر۔ لعنت ہو تجھ پر۔ تو کیا ہے یا تیری حیثیت کیا ہے!"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مستانی سوتے میں اس طرح کیوں ... اور کس سے مخاطب ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اپنے بارے میں خیال پیدا ہوا اور میں خوف سے کانپ اٹھا۔ ممکن ہے مجھ سے غیر دانستگی میں کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو جس کا علم مستانی کو اب ہوا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں کپکپاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر بولا "مجھے معاف کر دے مستانی، مجھے معاف کر دے" میں دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

لیکن وہ بدستور آنکھیں بند کیے ہوئے بڑبڑائی "بے شرم ... یہ شہر میرا ہے۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ دیکھ مان جا ... مان جا، نہیں تو میں آتی ہوں۔"

اور پھر اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ سوئی ہوئی مستانی کے جسم سے ایک اور مستانی اٹھی ... بالکل ویسی ہی، اور نہایت ہی تیزی کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکل گئی۔

یا الٰہی، یہ کیا اسرار ہے۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔

"جاؤ خان، جا کر آرام کرو" سوئی ہوئی مستانی نے مجھے حکم دیا۔

میں حیران و پریشان اپنی جگہ سے اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے ہوئے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مستانی کوٹھری میں داخل ہوئی اور سوئی ہوئی مستانی کے برابر میں جا کر لیٹ گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پلنگ پر صرف ایک ہی مستانی تھی۔

مستانی کی شخصیت کا یہ پہلو اتنا پُراسرار اور چونکا دینے والا تھا کہ رات بھر سوچتا رہا پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو رات کا واقعہ دوبارہ ذہن میں تازہ ہوگیا۔ مستانی کی طرف دیکھا تو پلنگ خالی پڑا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتا ہوا کوٹھری

کے دروازے پر آگیا۔

میں نے دیکھا مستانی تالاب کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی اپنے بال سُکھا رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اور قریب ہی ایک دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ یہ پتھر بالکل ہی لب تالاب تھا۔ میں نے تالاب کے پانی سے ہاتھ دھوئے اور چلو میں پانی لے کر منہ پر چھپکا مارا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گلاب کی مہک محسوس ہوئی۔ میں نے مستانی کی طرف دیکھا۔ اس کے بال جن میں اکثر مٹی پڑی نظر آتی تھی، صبح کی دھوپ میں سیاہ ریشم کی مانند چمک رہے تھے۔ اور جب مستانی ان کا پانی ہاتھ سے جھٹکتی تھی تو ان میں سے پانی کے قطروں کے ساتھ ساتھ گلاب کی مہک بھی اڑتی تھی۔

میں اس کے بالوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہا ہے؟“ مستانی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے بات بنائی ”آج تم شہر نہیں گئیں؟“

”آج بابا شہر گیا ہے“ مستانی نے مختصر سا جواب دیا۔

”رات تم کس سے مخاطب تھیں، کہاں گئی تھیں، کیا تمہارے دو جسم ہیں؟“ میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”وقت کا انتظار کر، خان“ مستانی نے پر سکون لہجہ میں جواب دیا ”کچھ راز ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر سے پردہ وقت سے پہلے نہیں ہٹایا جا سکتا۔“

”مستانی!“ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا ”مجھے تو بتا دے کہ تو کیا ہے؟“

مستانی نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پیار بھرے غصے سے بولی ”خان، میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ آخر کو تو مرد ہے۔ ضد تیری فطرت میں شامل ہے۔“

”نہیں، یہ بات نہیں“ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کہا۔ ”میں مرد ضرور ہوں لیکن ضدی

نہیں ہوں۔“

”نہیں، تجھے پوچھنے کا حق ہے اس لیے کہ تو مرد ہے تجھے برتری حاصل ہے“ مستانی نے اسی انداز سے کہا۔

مستانی کی یہ بات سن کر میرے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اٹھی۔

”لیکن خان،“ وہ اپنے بالوں کو گردن کے پیچھے سمیٹتے ہوئے بولی ”حق تعالیٰ کے حضور میں وہ برتر ہے جس کے اعمال اچھے ہیں، جس کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے۔“

مستانی کے اس جملے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک سیکنڈ میں ماضی میری نظروں کے سامنے سے گزر گیا۔ میرے قول و فعل میں تضاد تھا۔

”خان، تمہیں ہر انہونی بات جاننے کا شوق تو ہے لیکن حاصل کرنے کا جوش نہیں“ مستانی نے نہایت لطیف انداز میں میرے رویہ پر اعتراض کیا تھا۔ مجھے پہلی بار اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوا۔

”بولو، جواب دو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے نہایت نرم لہجہ میں پوچھا۔

ہونٹ سی دیئے تھے۔ میں خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھا رہا۔

”تم نے فانی دنیا کو چھوڑ کر ابدی دنیا کو اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تم نے حق تعالیٰ کے نام کی تسبیح پڑھنا کیوں چھوڑ دی۔ تم اپنے فیصلے سے کیوں پھر گئے؟“ پھر وہ سیکنڈ کے لیے رکی اور نہایت ہی کرخت لہجہ میں بولی ”اگر تم اپنا فیصلہ بدل چکے ہو تو میرا فیصلہ بھی سن لو۔ تم واپس اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔“

مستانی کے اس فیصلہ سے میں تڑپ اٹھا۔ مجھے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے سے جدا بھی کر سکتی ہے۔ اس کی جدائی کا تصور ہی میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں نے والہانہ جذبے سے کہا ”مستانی میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔“

"کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟" اس نے برجستہ پوچھا۔

"اس لیے ... اس لیے ... کہ ... میں ..."

"تو مجھ سے عشق کرتا ہے۔" مستانی نے جیسے میرے دل کی بات پڑھ لی ہو۔ "لیکن شاید تجھے یاد ہو" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "میں نے تیری مردانہ فطرت کو دیکھتے ہوئے بتایا تھا کہ سچے عاشق کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ہر حکم کی تعمیل کرے لیکن بتا تو نے میرا کون سا حکم مانا ہے اور جب تو میرے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا تو خالق دوجہاں کے حکم کی تعمیل کیا کرے گا۔"

"مستانی ... مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "دراصل جس دن تو نے مجھے سکھ دیو کے ارادے سے آگاہ کیا تھا، اس ہی دن سے میں رقابت کی آگ میں جل رہا ہوں۔ اس آگ نے مجھے ہر مقصد سے بیگانہ کر دیا تھا۔"

"سکھ دیو ..." وہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اگر تجھے سکھ دیو سے رقابت تھی تو چاہیے تھا کہ خود بھی سکھ دیو جیسا بننے کی کوشش کرتا۔ تو نہیں جانتا کہ وہ انتہائی مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ کسی کو شکست دینے کی خاطر اس کے ہم مرتبہ ہونا ضروری ہے خان!" پھر وہ اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی "تجھ سے سکھ دیو کا تذکرہ میں نے اس ہی وجہ سے کیا تھا کہ تو رقابت کی آگ میں جل کر زیادہ سے زیادہ روحانی قوت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن تو تو اس آگ میں خود ہی بھسم ہو کر رہ گیا۔"

مستانی کے اس انکشاف سے مجھے بہت ہی دکھ ہوا۔ میرے ماہ و سال یوں ہی ضائع ہو گئے۔ واقعی رقابت کی آگ میں میں خود ہی جل رہا تھا۔

"میں نے تمہیں قدم قدم پر نفس کو مغلوب کرنے کی تاکید کی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "میں جانتی تھی کہ یہ بہت ہی مشکل کام ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے محبوب کے نام کی تسبیح تمہاری روح کو صاف کر دے گی اور تمہارا نفس تمہارے تابع ہو جائے گا۔ اور تم

عشق الٰہی کی منزل کی طرف محو پرواز ہو جاؤ گے ... لیکن تم ... تم ... تو خود نفس کے غلام بن کر رہ گئے ہو۔" وہ غصہ سے بولی "نفس نے تمہیں اپنا غلام بنا لیا ہے۔ اور ایسے نفس پرست لوگوں کے لیے میرے آستانے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے نہایت بے رخی سے منہ پھیر لیا اور جانے کی خاطر کوٹھری کی طرف قدم بڑھایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری دنیا لٹ چکی ہے۔ میں تنہا رہ گیا ہوں اور اس سے پہلے کہ مستانی دوسرا قدم اٹھاتی میں نے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔

میرا سر اس کے قدموں میں تھا۔ میں نے ہاتھوں سے اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے اور میں رو رو کر کہہ رہا تھا "مستانی، مجھے معاف کر دے، خدا کے لیے معاف کر دے، میں اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی چاہتا ہوں۔"

"اٹھو خان!" مستانی نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا "معافی کا حق صرف حق تعالیٰ کو ہے۔ تمہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے میرے لیے یہی کافی ہے۔"

میں اٹھ کر دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ مستانی میری آنکھوں کے آنسو اپنی آستین سے صاف کرتے ہوئے بولی "تمہاری ندامت سے ظاہر ہو گیا ہے کہ تم آج بھی روحانیت کے متلاشی ہو۔ تمہارے دل میں آج بھی عشق الٰہی کی تڑپ ہے ... اور ... اور" میری آنکھوں کے سامنے ناقابل بیان منظر تھا۔ میں ہر منظر میں غلاف کعبہ سے لپٹ کر رو رہا تھا۔

مستانی کیا کہہ رہی تھی، مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تو اپنے خدا کے حضور میں گڑگڑا رہا تھا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ میں روتا رہا۔ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اچانک یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مستانی نے اپنی آستین کھینچ لی۔

"مستانی!" میں عالم بے خودی میں چلایا اور ایک بار پھر اس کے قدموں پر گرا لیکن اس مرتبہ گرتے ہی مستانی نے مجھے ہاتھوں پر روک لیا اور کسی قدر ڈانٹتے ہوئے بولی "ہوش میں آؤ خان! سجدہ صرف خدا کو کرنا لازم ہے۔"

میں اس کی ڈانٹ سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرا دل اور دماغ بالکل ہلکے ہو چکے تھے۔ میرے پورے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ یہ میرے گناہوں کی تلافی ہو جانے کی نشانی تھی۔

"فنان!" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "آج سے تم اس بات کا عہد کرلو کہ فانی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں رکھو گے۔ میں کیا ہوں" اس نے انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ "میں بھی فانی ہوں۔ میں بھی مٹی کا ڈھیر ہوں۔ تم مجھے اور اس شئے کو جسے تم چاہو، جس کی تمہارے دل میں خواہش ہو مٹی سے زیادہ نہ سمجھو۔ ہر شئے کو بے مصرف جانو۔ تمہارے دل اور دماغ میں صرف اور صرف ابدی دنیا کا تصور ہونا چاہیے۔"

مستانی کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں سمایا جا رہا تھا۔

"تلخ سے تلخ بات برداشت کرو۔" وہ اسی انداز سے بولی۔ "بڑے سے بڑا ظلم ہنس کر سہہ جاؤ۔ نفس کو ہر طرح کچل دو۔ سمجھو کہ تم خود بھی مٹی ہو جس کا کام صرف اپنے رب کا شکر کرنا ہے اور آج سے تم حق اللہ کی صدا لگایا کرو۔"

درسِ آگہی

مستانی نے مجھے ایک خاص طریقے سے حق اللہ کی صدا لگانے کی تلقین کی۔ اس طریقہ سے جب میں اپنے دل پر حق اللہ کی ضرب لگاتا تھا تو مجھے اپنے دل سے نور کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس ضرب کے لگتے ہی میری باطنی آنکھ کھل جاتی ہے اور ہر شئے سے یہی آواز سنائی دیتی ہے حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس ضرب کی، اس صدا کی دیگر خصوصیات نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ "حق اللہ" کی صدا کے ساتھ ہی تمام مادی اور غیر مادی اشیاء سجدہ ریز ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں "اللہ ہو" کا نعرہ لگا دیتا تو بہتا ہوا دریائے سندھ بھی ساکن ہو جاتا تھا۔

چند سال گزرنے کے بعد مستانی نے مجھے "سبحان اللہ" کی تکرار کا طریقہ بتایا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد میں جانوروں کی بولیاں سمجھنے لگا۔ میری زبان میں یہ تاثیر پیدا ہوگئی کہ سبحان اللہ کی آواز کے ساتھ ہی پرندے بھی میری جانب متوجہ ہو جاتے، میری آواز کے ساتھ آواز ملاتے ہوئے "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کہتے۔

پھر مستانی نے مجھے اور طریقے، اور صدائیں، اور وظیفے بتائے۔ اب مجھ میں اتنی قوت پیدا ہو چلی تھی کہ جاندار اور بے جان چیزوں کو روک سکتا تھا۔ میری نظر اتنی وسیع

میں اس کی ڈانٹ سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرا دل اور دماغ بالکل ہلکے ہو چکے تھے۔ میرے پورے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ یہ میرے گناہوں کی تلافی ہو جانے کی نشانی تھی۔

"خان!" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "آج سے تم اس بات کا عہد کرلو کہ فانی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں رکھو گے۔ میں کیا ہوں" اس نے انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا "میں بھی فانی ہوں، میں بھی مٹی کا ڈھیر ہوں۔ تم مجھے اور اس شئے کو جسے تم چاہو، جس کی تمہارے دل میں خواہش ہو مٹی سے زیادہ نہ سمجھو۔ ہر شئے کو بے مصرف جانو۔ تمہارے دل اور دماغ میں صرف اور صرف ابدی دنیا کا تصور ہونا چاہیے"

مستانی کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں سمایا جا رہا تھا۔

"تلخ سے تلخ بات برداشت کرو" وہ اسی انداز سے بولی "بڑے سے بڑا ظلم ہنس کر سہہ جاؤ۔ نفس کو ہر طرح کچل دو۔ سمجھ لو کہ تم خود بھی مٹی ہو جس کا کام صرف اپنے رب کی شکر کرنا ہے اور آج سے تم حق اللہ کی صدا لگایا کرو"

درسِ آگہی

مستانی نے مجھے ایک خاص طریقے سے حق اللہ کی صدا لگانے کی تلقین کی۔ اس طریقہ سے جب میں اپنے دل پر حق اللہ کی ضرب لگاتا تھا تو مجھے اپنے دل سے نور کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس ضرب کے لگتے ہی میری باطنی آنکھ کھل جاتی ہے اور ہر شئے سے یہی آواز سنائی دیتی ہے حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس ضرب کی، اس صدا کی دیگر خصوصیات نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ "حق اللہ" کی صدا کے ساتھ ہی تمام مادی اور غیر مادی اشیاء سجدہ ریز ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں "اللہ ہو" کا نعرہ لگا دیتا تو بہتا ہوا دریائے سندھ بھی ساکن ہو جاتا تھا۔

چند سال گزرنے کے بعد مستانی نے مجھے "سبحان اللہ" کی تکرار کا طریقہ بتایا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد میں جانوروں کی بولیاں سمجھنے لگا۔ میری زبان میں یہ تاثیر پیدا ہو گئی کہ سبحان اللہ کی آواز کے ساتھ ہی پرندے بھی میری جانب متوجہ ہو جاتے، میری آواز کے ساتھ آواز ملا کر "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کہتے۔

پھر مستانی نے مجھے اور طریقے، اور صدائیں، اور وظیفے بتائے۔ اب مجھ میں اتنی قوت پیدا ہو چلی تھی کہ جاندار اور بے جان چیزوں کو روک سکتا تھا۔ میری نظر اتنی وسیع

ہو گئی تھی کہ اگر چاہتا تو کوہ ہمالیہ کے پار دیکھ سکتا تھا۔ زمین میں پوشیدہ خزانے مجھے صاف نظر آتے تھے آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تھا تو ایک دوسری ہی دنیا نظر آتی تھی۔

ان تمام حقیقتوں کے پا جانے کے باوجود میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی تو میری نگاہ وسیع ہوئی تھی، ابھی تو میری باطنی بصیرت بیدار ہوئی تھی۔ ابھی تو میں کسی شے کا صرف ظاہری وجود ہی دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی عالم دو عالم کا تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ میری نگاہوں سے اب کوئی شے پوشیدہ نہیں تھی لیکن مجھے کسی بھی شے پر اختیار حاصل نہیں تھا۔

میں ایک دن مغرب کی نماز سے فارغ ہوا تو خلاف معمول مستانی کو کوٹھڑی میں موجود پایا۔ وہ نہایت ہی قیمتی کپڑے کا غرارہ اور کرتا پہنے آئینہ کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔

اسے پہلی بار اس حلیہ میں دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا۔ ابھی میں کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بالوں میں گلاب کے پھولوں کا گجرا باندھتے ہوئے ایک دم پلٹ پڑی۔ میں نے دیکھا وہ حسن کی تمام رعنائیوں سے مزین تھی۔

" میں .... میں .... کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے نہایت دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

" اچھی لگ رہی ہو" میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا" لیکن اب تمہیں یہ سوانگ رچانے کی قطعی ضرورت نہیں اس لیے کہ میرا نفس میرے قابو میں ہے"

میرا خیال تھا کہ مستانی نے یہ سب کچھ مجھے آزمانے کی خاطر کیا ہے۔

" کتنے بھولے ہو تم" وہ زور سے ہنس کر بولی" مجھے تمہیں آزمانے کی ضرورت نہیں یہ سنگھار تو میں نے اپنے محبوب کی خاطر کیا ہے" پھر اس نے والہانہ انداز میں ایک چکر لگایا اور مجھ سے بولی" چلو تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ"

" کیوں، کیا بات ہے، کہاں چلنا ہے؟" میں نے اس کا ارادہ معلوم کرنے

کی کوشش کی۔

" خان! تیری فطرت نہیں جاتی" اس نے شکوہ کیا" ہر بات پوچھنا ضرور ہے" پھر وہ میرے قریب آ کر بولی" آج سے ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ بڑا ہی بابرکت مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں میرے محبوب کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں ہمیں بھی آج ایک ایسی ہی محفل میں شریک ہونا ہے۔ جاؤ .... جلدی تیار ہو جاؤ، میرپور خاص جانا ہے"

" میرپور خاص .... !" میں نے تعجب سے پوچھا۔

" ہاں، وہاں نماز عشاء کے بعد عید میلاد النبی کی محفل ہے" مستانی نے مجھے بتایا۔

" عشاء کے بعد ....؟" میں نے مزید تعجب سے پوچھا" اور پھر میرپور خاص جائیں گے کیسے؟ جب کہ وقت بھی کم ہے"

" پھر وہی بات" مستانی نے مجھے ٹوکا" جس نے بلایا ہے وہ خود ہی پہنچنے کا انتظام بھی کر دے گا۔ بس تو جلدی سے تیار ہو جا۔ تیرے کپڑے پلنگ پر رکھے ہیں"

مستانی کے کسی بھی حکم سے انکار کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں مصلّی سے اٹھا۔ پلنگ کے پاس آیا۔ تو بالکل نیا جوڑا جیسا کہ مستانی نے پہن رکھا تھا، ملا۔ میں نے ایک نظر مستانی کی طرف دیکھا۔

" پہن لے خان، جنس کی تقسیم غیر فانی لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بندہ عورت کے روپ میں ہو یا مرد کے بہروپ میں حق تعالٰے کے نزدیک بندہ ہے" مستانی نے مجھے سمجھایا۔

میں نے لباس تبدیل کیا۔ اور پھر ہم دونوں کوٹھڑی کے باہر نکل آئے۔

جب ہم معصوم شاہ کھوڑا کے مقبرہ والی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تو سورج مغرب میں چھپ چکا تھا۔ اور آسمان پر پھیلی ہوئی شفق کی لالی دھندلا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ سینٹرل جیل پہنچ کر مستانی کسی تانگہ والے سے کہے گی اور وہ ہمیں اسٹیشن چھوڑ دے گا۔ جہاں سے

ریل کے ذریعے میرپور خاص پہنچ جائیں گے، لیکن کیا ہم وقت پر پہنچ جائیں گے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو کہ مجھے بار بار پریشان کر رہا تھا۔

جب ہم سینٹرل جیل کے سامنے پہنچے تو رات کی سیاہی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں میرآباد میں ابھی زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ مستانی نے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی۔ اُسے تانگہ والے کی تلاش تھی لیکن سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ البتہ اکا دکا آدمی آجا رہے تھے۔ "ابھی عشاء میں دیر ہے" مستانی مجھ سے بولی "آؤ مارکیٹ تک پیدل چلتے ہیں۔ وہاں سے اسٹیشن کے لیے تانگہ جلد ہی مل جائے گا۔"

میں نے اس کی تائید کی۔ اور پھر مارکیٹ کی طرف جانے والی اس سڑک پر ہو لیے جو آج بھی جیل روڈ کہلاتی ہے۔

ہم دونوں سڑک کے کنارے سر جھکائے میرآباد سے گزر رہے تھے۔ عورت کے بھروپ میں مجھے بہت زیادہ شرم آ رہی تھی۔ ابھی ہم کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ مستانی نے میرا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے اس غیر متوقع رویے پر میں چونکا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا ہاتھ جیسے مستانی نے نہیں پکڑ رکھا ہے بلکہ کسی آہنی شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہے۔

میں نے بے بسی سے مستانی کی طرف دیکھا، وہ مسکراتی ہوئی گردن جھکائے چل رہی تھی۔ پھر مجھے اللہ اکبر، اللہ اکبر اذان سنائی دی۔

"اوہ عشاء کا وقت ہو گیا" میں نے چڑ کر کہا "اور ہم ابھی مارکیٹ تک بھی نہیں پہنچ پائے"

مستانی نے کوئی جواب دینے کے بجائے میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ میں یہ دیکھنے کی خاطر کہ ابھی مارکیٹ کتنی دور ہے اوپر گردن اٹھائی لیکن وہاں تو دور دور تک

مارکیٹ کا نام و نشان نہیں تھا۔ بلکہ ہم ایک گلی میں سے گزر رہے تھے جس کے آخری مکان کے دروازے پر "جشن عید میلاد النبی ﷺ" کا برقی بورڈ لگا ہوا تھا۔۔۔ تو کیا ہم میرپور خاص پہنچ گئے!

میں نے معنی خیز نظروں سے مستانی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا مجھے اشارہ کیا۔ اور پھر نہایت ہی آہستہ سے بولی "اس محفل کا انتظام خواتین نے کیا ہے اور خواتین توہمات پر زیادہ یقین رکھتی ہیں۔ لہٰذا یہاں کوئی بھی بات دیکھو تو کوئی غیر متوقع حرکت نہ کرنا۔"

اس کے کہنے پر میں نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور پھر ہم دونوں دروازے پر پہنچ گئے۔

مکان کے صدر دروازے پر ایک جاذب نظر ادھیڑ عمر عورت نے مستانی کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اسے سینے سے لگایا، پیشانی چومی، اور پھر اس کمرہ تک چھوڑنے بھی آگئی جس میں عید میلاد النبی ﷺ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ ایک کافی بڑا سا ہال تھا جس میں نہایت ہی خوش نما دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ہال کے آخری سرے پر زمین سے قدرے ایک فٹ بلند اسٹیج تھا جس کے کونوں پر لوبان سلگ رہا تھا۔ اور اس کی مسحور کن خوشبو پورے ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔

جس وقت مستانی کے ساتھ میں اندر داخل ہوا تو پورا ہال عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور سب کی سب حسب عادت نجی نوعیت کی باتوں میں مصروف تھیں۔

مستانی نے جیسے ہی قدم اندر رکھا۔ یکبارگی سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ سب کی سب خاموشی سے اُسے دیکھے جا رہی تھیں۔ اور کیوں نہ دیکھتیں، گلاب کی خوشبو نے ان سب کے دماغوں کو معطر کر دیا تھا۔ مستانی سب کے درمیان سے نہایت ہی پُروقار انداز میں گزرتی ہوئی چبوترہ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ مستانی کے بیٹھتے ہی عورتیں پھر باتوں میں مشغول ہو گئیں لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے مستانی کو بھی چور نظروں

سے دیکھ رہی تھیں۔

"جانتے ہو، یہ مکان کس کا ہے؟" مستانی نے نہایت دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"میں نے نفی کے انداز میں گردن ہلا دی۔

"یہ ایک ہندو طوائف کا مکان ہے" مستانی نے بتایا۔ "وہ جس نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا تھا، اس کا نام لیلاوتی تھا۔ لیکن اب وہ خیر النساء ہے۔

"تو، کیا وہ مسلمان ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ اس پر اللہ کی رحمت ہے" مستانی بولی۔ "اب وہ نہ صرف مسلمان ہو چکی ہے بلکہ اپنی گناہ آلود زندگی سے تائب بھی ہو چکی ہے اور اب عشقِ رسول میں مگن زندگی گزار رہی ہے"

اس کے ساتھ ہی مستانی نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا، دروازہ کے عین درمیان میں ایک سولہ، سترہ سالہ لڑکی کھڑی سب کا جائزہ لے رہی ہے جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ اس کے معصوم حسن سے میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ "یہ خیر النساء کی بیٹی مہر النساء ہے"

مستانی نے مجھے بتایا۔ "دونوں ماں بیٹیاں نہایت ہی پاک صاف زندگی گزار رہی ہیں۔ اس لڑکی کو قرآن کی تعلیم میں دے رہی ہوں"

مستانی کے آخری جملے پر میں چونک اٹھا۔ اور حیرت سے پوچھا "تم... تم... ہر روز یہاں آتی ہو۔۔۔؟"

مستانی نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

مہر النساء نے مستانی کو دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا وہ نہایت تیزی سے اس کے قریب آئی اور سلام کرنے کے بعد گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ مستانی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

اتنے میں خیر النساء نے محفلِ میلاد شروع کیے جانے کا اعلان کیا۔ عورتیں جو کہ ابھی تک غول بنائے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، سنبھل سنبھل کر اسٹیج کے رخ ہو کر بیٹھ گئیں۔

مستانی اپنا غرارہ سمیٹتی ہوئی اسٹیج پر آ گئی۔ اس نے اپنے دوپٹے کو سر پر اس طرح اوڑھا کہ تمام بال اور جسم چھپ گیا۔ اس کے بعد اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

میری بہنو! آپ سب کو معلوم ہے کہ یہ محفل کس کی شان میں منعقد کی گئی ہے۔ لہٰذا میری ان تمام بہنوں سے جو کہ نسوار استعمال کرتی ہیں یا بیڑی پیتی ہیں، گزارش ہے کہ وہ اب جب تک محفل ختم نہ ہو جائے کسی بھی چیز کا استعمال نہ کریں۔

خیال رہے کہ اندرون سندھ خواتین نسوار اور بیڑی کا استعمال کثرت سے کرتی ہیں۔

اس کے بعد وہ تھوڑی دیر کو رکی جیسے وہ اپنی ہدایت کا جائزہ لے رہی ہو اور پھر اس نے محفلِ میلاد کا آغاز کرتے ہوئے تلاوتِ قرآن پاک کے لیے مہر النساء کا نام پکارا۔

مہر النساء کی آواز اور قرآن کے الفاظ — ان دونوں نے ایسا سماں باندھا کہ محفل میں سناٹا چھا گیا اور ماحول سحر زدہ ہو کر رہ گیا۔

تلاوتِ قرآن پاک کے ختم ہوتے ہی خواتین اس طرح چونکیں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ہوں۔ مستانی نے سب سے پہلے درود شریف پڑھا اور پھر سیرت النبیؐ کے سلسلے میں اپنی تقریر کا آغاز اس طرح کیا۔

معزز خواتین!

آپ کو معلوم ہے کہ ہر سال آج کے دن اسی جگہ عید میلاد النبیؐ کی محفل منعقد ہوتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ آج خیر النساء اور مہر النساء کی خواہش پر مجھے یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ اس محفل کے شرکاء سے خطاب کروں میری بہنو! اس محفل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں نذرانہ عقیدت ان کے معجزوں کو بیان کر کے پیش کریں بلکہ ہمارا صحیح اور حقیقی نذرانہ عقیدت یہ ہے کہ ہم اپنے نبیؐ کے حکم پر عمل کریں۔ ان کے اسوۂ حسنہ کو دل سے اپنائیں اور وہ سب کریں جو نبیؐ نے ہمارے لیے خود کر کے دکھلایا ہے۔

آج سے پہلے، جتنی بھی محفلیں ہوئی ہیں ان میں میلاد پڑھنے والیوں نے وہی پڑھا جو لکھا ہوا تھا۔ اور لکھنے والوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اپنے جذبۂ محبت اور عقیدت کی بنا پر لکھا ہے جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ساری دلچسپی حصولِ ثواب کے لیے رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں نہایت ہی دھوم سے محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ پھر مقرر اہلِ محفل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہایت پراسرار اور متحیر کر دینے والے واقعات سناتا ہے۔ یاد رکھئے! (وہ انگلی اٹھا کر بولی) انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ کسی بھی نظریئے کو اپنانے سے پہلے اس کے مبلغ کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور پھر اس کے ذہن میں مبلغ کا جو بھی تصور سما جاتا ہے وہ ویسے ہی نظریہ کو اپنا لیتا ہے۔

میری بہنو!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نوعِ انسانی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی و اخلاقی درجہ نہایت بلند ہے۔ وہاں معجزے ہیں۔ اور ان کے دربار میں فرشتے بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہستی اتنی پاک ہے کہ اللہ بھی اس پاکیزہ ہستی پر درود و سلام بھیجتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ ہم حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ سے عزم و ہمت کا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضورؐ کی سیرتِ پاک سے خود شناسی اور انسانیت کا جذبہ اخذ کر سکتے ہیں۔

میری بہنو!

ہم اگر اپنے پیارے نبیؐ کے مقدس کردار کو صرف معجزہ سمجھنے لگیں گے تو پھر بتاؤ، ہم مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے کیا رہ جاتا ہے!

بتاؤ، مٹی کے بنے ہوئے انسان ان کے عمل کو کس طرح مشعلِ راہ بنائیں گے!

یہ بھی بتاؤ، کہ ہم ان نقشِ قدم پر کس طرح عمل پیرا ہوں گے!

اتنا کہنے کے بعد اس نے حاضرینِ مجلس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر اسی جذبہ سے بولی:۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خاک کے پتلے نور کی پیروی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کو معجزہ سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں یہ مصدقہ حقیقت ہے کہ وہ عین قرآن کے مطابق اور احکامِ خداوندی کے تابع تھی۔ آپؐ کی زندگی ایک مکمل انسان کی زندگی تھی۔

یاد رکھو! تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جو ایک بار آپؐ کے پاس آیا، اُسے پھر زندگی کے کسی بھی معاملے میں کسی دوسرے کے پاس ہدایت کے لیے نہیں جانا پڑا کیوں کہ آپ میں تمام انسانی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں جنہیں آپؐ موقع و محل کے مطابق کام میں لاتے تھے۔

اوّل دور کے مسلمانوں کا آج کے دور کے مسلمانوں پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس عظیم ہستی کی زندگی کو اس طرح سے محفوظ کر دیا ہے کہ کوئی گوشہ انسانی آنکھ سے اوجھل نہیں ہو پایا اور یہ سب اتنا سچ اور صحیح ہے کہ غیر مسلم تک انگشت نمائی کرنے سے عاجز ہیں۔ آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو انسان کے لیے روشنی کا مینار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سورج کی مانند ہے۔ جس کی روشنی ہر شعبہ پر پڑ رہی ہے اور حق کے متلاشی اس روشنی میں صراطِ مستقیم کی راہ پا لیتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی زندگی آج بھی روزِ اوّل کی طرح روشن ہے۔ جس طرح قرآن آج بھی روزِ اوّل کی طرح مستند ہے۔

میری بہنو!

اگر ہمیں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ہے تو ہمیں چاہیے کہ پکے عاشق کی طرح اپنے محبوب پیغمبر کے ہر عمل کو ہم اپنا عمل بنا لیں،

اگر ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی عقیدت ہے تو ہمیں آج ہی اس بات کا عہد کر لینا چاہیے کہ ہم آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کریں گے۔

ہمارا سچا اور صحیح نذرانۂ عقیدت یہی ہے کہ ہم ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل کریں۔

یاد رکھیئے۔ مستانی نے نہایت ہی جوش سے کہا۔ رسول کی اتباع خدا سے محبت کا ثبوت ہے۔

اس کے ساتھ ہی پورے ہال میں حنا کی خوشبو پھیل گئی اور روشنی کے دو تین جھماکے ہوئے۔ مستانی نے فوراً ہی اپنی تقریر روک دی اور خواتین سے کہا کہ وہ درود شریف کا ورد شروع کریں۔ پورا ہال درود شریف کی سحر انگیز آواز سے گونجنے لگا۔

مستانی جھوم جھوم کر درود شریف پڑھ رہی تھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پورے ہال پر سایۂ رحمت محیط ہے۔ ہر طرف نور ہی نور تھا اور پھر میں بھی درود شریف پڑھنے میں ایسا محو ہوا کہ مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کوٹھری میں مصلّے پر بیٹھا تھا۔ اور فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ مستانی وہی لمبا سا کرتا پہنے کونے میں بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔

"کپڑے تبدیل کر کے چائے پی لو" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پلنگ کے پاس آگیا۔ میرے پرانے کپڑے موجود تھے۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر مستانی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"لو۔ چائے پیو!" مستانی نے ایک پیالہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "مجھے دو باتوں کی جستجو ہے۔ تمہارے پاس نئے کپڑوں کا جوڑا کہاں سے آیا، اور ہم بغیر کسی وسیلے کے میرپور خاص کیسے پہنچ گئے، اور واپس بھی آ گئے؟"

میری یہ بات سن کر مستانی مسکرائی اور پھر چائے کا گھونٹ لے کر بولی "وقت اور فاصلہ سب کچھ انسان کے تابع ہے خان۔ قرآن کے مطابق حق تعالیٰ نے جہاں شمس و قمر، ارض و سماوات سب کا حاکم بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

"ہوں۔۔۔!" میں نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اقرار کیا۔

"خان! تمہاری نظر اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ تم مادہ کے اندر جھانک سکتے ہو۔ زمین اور آسمان تمہارے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہیں۔ تم خود سوچو، اس کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے" مستانی نے اتنا کہا، اور اطمینان سے چائے پینے لگی۔

مستانی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ میری نظر وسیع ہو چکی تھی میں مادی اشیاء کے اندر جھانک سکتا تھا لیکن ان کے تصرف کا طریقہ کیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی "جب حق تعالیٰ وسائل کے بغیر حاکم ہے تو اس کا نائب بھی وسائل کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کا نائب اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ کائنات کا باطن نور خداوندی ہے۔ اس ہی وجہ سے اس کا نائب بھی کائنات میں تصرف کر سکتا ہے"

"لیکن۔۔۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے!" میں نے پوچھا۔

"سب کچھ ممکن ہے خان" وہ چائے کا پیالہ لکڑی کے بوسیدہ صندوق پر رکھ کر بولی "جب کوئی انسان حق تعالیٰ کا تصور کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی آنکھ کا ادراک بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے، وہی ابتدا ہے، وہی انتہا ہے" پھر وہ انگلی اٹھا کر بولی "جب تم "حق اللہ" "یا" "اللہ ہو" کا نعرہ لگاتے ہو تو تمہارا ذہن اور آنکھ دونوں کا مرکز حق تعالیٰ ہوتا ہے۔ اور انسان کے پاس یہی دو ایسے وسیلے ہیں جن کی بدولت انوار الٰہی کا دیدار کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس ہی قوت کو اور زیادہ بڑھا دیا جائے تو انسان کے تابع ہر شئے ہو سکتی ہے۔ زمانہ اور وقت اس کے ذہن کی حرکت سے بدل سکتا ہے"

"اس قوت کو کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے؟" میں نے بڑے ہی شوق سے پوچھا۔

"اس قوت کو بڑھانے کی خاطر انسان کو مادہ سے نجات حاصل کرنا پڑتی ہے" مستانی نے جواب دیا۔

"مادہ سے نجات حاصل کرنا۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔!" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"جسم مادہ ہے۔ اور مادہ وزن رکھتا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا "جبکہ روح ہر شئے کا باطنی نور ہے اور اس طرح نور پر حکم چلانے کی خاطر نوری درکار ہوتا ہے کیونکہ نور لطیف ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس نور کی خاطر جسم سے نجات حاصل کرے۔"

"... یعنی، مر جائے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

وہ میری بات پر کھل کھلا کر ہنسی۔ پھر سنجیدگی سے بولی "نہیں .... بلکہ اپنے اندر پوشیدہ نور پر دسترس حاصل کرے اور جانتے ہو وہ نور کیا ہے؟" یہ کہہ کر وہ جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"نہیں، میں نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ روح ہے۔" اس نے بتلایا۔

روح کا نام سنتے ہی میرے دل و دماغ میں سویا ہوا شوق ایک بار پھر بیدار ہو گیا۔

مسانی ذرا بھر کو مسکرائی اور پھر پیار بھرے لہجے میں بولی "در حقیقت یہی شوق تم کو یہاں لایا تھا۔ لیکن یہاں اگر تم دوسرے چکروں میں پڑ گئے۔"

"یہ سب تمہارا کرم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔" مسانی نے بتایا۔ "اور تم اب اس مقام تک پہنچ گئے ہو جہاں کائنات کے رازوں پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ تمہاری بالغ نگاہ وسیع ہو چکی ہے اور تم ہر شئے کے اندر جھانک سکتے ہو۔"

میں نے تفکر کے انداز میں گردن ہلائی اور پھر پوچھا۔ "روح کیا ہے؟"

"روح کیا ہے؟" مسانی نے الفاظ کو دہرایا۔ پھر بولی "یہ ایک ایسا راز ہے جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے قرآن میں بھی خاموش رہنے کو کہا ہے کیونکہ یہی اس کی قدرت کا راز ہے۔"

"لیکن، روح مرکز حیات ہے۔" میں نے اپنی عقل کے مطابق کہا۔ "روح منبع حیات ہے

اس لحاظ سے وہ نہایت قوی ہے، نہایت ہی اہم ہے۔ اور اس کے بارے میں بھی انسان کو بتایا جانا چاہیئے تھا۔"

"اس بارے میں انسان کو جتنا بتایا جانا چاہیے تھا، حق تعالیٰ نے بتایا ہے۔" مسانی نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سنو!" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر پلنگ کی طرف آتے ہوئے بولی۔ "جب انسان تخلیقی مراحل سے گزرتا ہوا چھٹے ماہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کے جسم میں روح داخل کر دی جاتی ہے۔ یہ وجود روح کی دلیل ہے۔ حیات کا احساس ہے۔ جسم میں روح کو داخل کیے جانے کے بعد بھی اس جسم کو مزید تین ماہ شکم مادر میں پرورش کیا جاتا ہے جس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ روح جسم انسانی میں مستحکم ہو جائے۔ پھر وہی جسم دنیا میں آتا ہے اور اس طرح اللہ کا یہ فرمان پورا ہوتا ہے کہ ہم نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا...."

اتنا کہہ کر وہ پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھتی ہوئی بولی "جب تک جسم طاقت ور رہتا ہے، اس وقت تک روح کا جسم سے تعلق رہتا ہے لیکن جب جسم اپنی طبعی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو روح جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے جسے موت کہا جاتا ہے۔ لیکن ___" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "قرآن میں اس زندگی کے بعد ایک اور ابدی زندگی کا تصور پیش کیا گیا ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ درحقیقت یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ روح کبھی فنا نہیں ہوتی۔"

"انسانی جسم کے فنا ہونے کے بعد روح کی موجودگی کی عقلی دلیل کیا ہے؟" میں نے پوچھا

"سنتے رہو۔" وہ دوبارہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "روحیں کیونکہ جسم میں ایک طویل عرصہ گزارتی ہیں۔ لہٰذا جسم سے نکلنے کے بعد ان کو جسمانی خدوخال کے مطابق ہی عالم برزخ میں رکھا جاتا ہے تاکہ قیامت کے دن انصاف کرنے میں آسانی ہو۔ عالم برزخ میں بھی ان روحوں کے درجات ہوتے ہیں۔ ان میں سے جن روحوں کے جسم احکام خداوندی کے خلاف دنیا میں کام

کرتے رہتے ہیں۔ ان کو سب سے کم درجہ میں رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے جسمانی اعمال کے مطابق اتنی بھاری اور گندی ہو جاتی ہے کہ دنیائے وحدت کی نوری حدود کو پار نہیں کر سکتیں۔ ان سے بھی نہایت ہی کمتر درجہ کی روحیں فضا میں بھٹکتی رہتی ہیں جنہیں دنیا والے اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ اب جہاں تک رُوح کی موجودگی کی عقلی ثبوت کی بات ہے ۔۔۔" وہ ہنس کر بولی "تو تم اپنی خالہ زاد بہن کا حال دیکھ چکے ہو جس پر ہنومان کی رُوح مسلط کر دی گئی تھی ۔۔۔۔۔ اور شانو کی رُوح سے بھی واقف ہو چکے ہو"

مستانی کی بات اپنی جگہ بہت بڑا عقلی ثبوت تھی۔ روحوں کی موجودگی کے جو اسباب بتائے تھے وہ بھی قابلِ اعتبار تھے۔

"ان روحوں کو قابو کس طرح کیا جا سکتا ہے؟" میں نے اصل موضوع کی بات کی۔

"ان کم درجہ کی روحوں کو قابو میں کرنے کا دنیا کے ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی طریقہ ہے" مستانی نے سوچتے ہوئے بتایا "لیکن ہمارے دین میں سب سے آسان اور سہل طریقہ ہے کلامِ الٰہی۔ جسے قرآن بھی کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہی ابدی دنیا کی مشترکہ زبان ہے۔ اور اس ہی زبان میں وہ جملے موجود ہیں جن کی مسلسل تکرار سے کائنات میں بھٹکتی ہوئی کسی بھی روح سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے"

"وہ ۔۔۔۔ کس طرح سے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اس کی مثال، تم اس طرح سمجھ سکتے ہو" مستانی نے تکیے سے سر اٹھا کر کہا "کہ ہمیں دنیا میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے ان سب میں 'قدرتِ الٰہی' پوشیدہ ہے۔ اور جب تم 'حق اللہ' کی صدا لگاتے ہو تو اس کی مسلسل تکرار سے ہر شئے میں پوشیدہ نورِ الٰہی عیاں ہونے لگتا ہے۔ بالکل اس ہی طرح مسلسل تکرار سے رُوح بھی عامل کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور پھر عامل جب چاہے اُس روح کو مخاطب کر سکتا ہے"

"یہ تو بہت آسان ہے" میں نے خوش ہو کر کہا "لیکن روح سے کس طرح کام لیا

جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رُوح سے روح کے ذریعے ہی کام لیا جا سکتا ہے" اس نے مسکرا کر جواب دیا "جب ہی تو میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ اپنی رُوح کو پاک کرو تاکہ تم دوسری اَرواح پر حکم چلا سکو"

"تو ۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ ابھی بھی ۔۔۔۔ میری رُوح ۔۔۔۔ پاک نہیں ہوئی؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ یہ بات نہیں" وہ میرا خدشہ سُن کر زور سے ہنسی "اب تم ٹھیک راستے پر چل رہے ہو" اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "یہی وجہ ہے آج میں تمہارے دل میں برسوں کے چھپے ہوئے تجسس کے بارے میں باتیں کر رہی ہوں۔ یاد رکھو!" وہ حسبِ عادت انگلی اٹھا کر بولی "جسم گوشت کا مادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس کی حرکات محدود ہوتی ہیں جبکہ رُوح نہایت ہی لطیف اور ہلکی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حرکات لامحدود ہوتی ہیں۔ اور وہ ایسے کام انجام دے لیتی ہیں جو کہ جسم انجام نہیں دے سکتا اور عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے"

اتنا کہہ کر مستانی نے تکیہ پر سَر اس طرح سے رکھ دیا جیسے وہ تھک گئی ہو۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ بولی "یہ تو ان روحوں کی بات تھی جو طبعی طور سے جسم کے ناکارہ ہو جانے کے بعد بھٹکتی رہتی ہیں، لیکن، اگر کوئی رُوح جسم کے فنا ہونے سے قبل ہی اپنے رب سے ناطہ جوڑ لے، تو؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے پوچھا "اگر ایسا ہے تو وہ رُوح سب سے زیادہ عظیم اور طاقتور ہو گی"

"ایسی روحیں جو جسم کے فنا ہونے سے قبل ہی حق تعالیٰ سے ناطہ جوڑ لیتی ہیں، تمام قیود سے آزاد ہوتی ہیں" مستانی نے دوبارہ کہنا شروع کیا "زمین و مکان ان کے لیے کوئی

اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ پلک جھپکتے میں کائنات کی وسعتوں کو پار کر لیتی ہیں۔ ایسی روحوں کو حق تعالےٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور وہ منشائے الٰہی کے مطابق کام انجام دیتی ہیں۔"

"وہ روحیں اتنی پاک اور مقدس ہوتی ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" مستانی نے میری حیرت پر مسکرا کر جواب دیا۔ "وہ نفس سے پاک روحیں ہوتی ہیں۔ انہیں فرشتوں سے زیادہ درجہ دیا جاتا ہے۔ ایسی روحیں احکام الٰہی کی منتظر رہتی ہیں۔ انہیں عرش معلیٰ سے بغیر کسی وسیلہ کے احکام ملتے رہتے ہیں۔ اور وہ منشائے الٰہی کے مطابق ہر کام انجام دیتی رہتی ہیں۔"

"یہ تو تم نے نہایت ہی عجیب بات بتائی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ ایسی روحوں کے جسم دنیا میں موجود رہتے ہیں۔" اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ خود ذاتِ الٰہی کے حضور میں سربسجود احکام کے منتظر رہتے ہیں۔"

"کمال ہے!" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "یعنی انسان چاہے تو زندگی ہی میں حق تعالیٰ سے ناطہ جوڑ سکتا ہے؟"

"بالکل!" مستانی نے تائیدی لہجہ میں کہا۔ "انسان چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دنیا والے اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شمار کر کے ان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں ——"

اتنا کہہ کر اس نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر نہایت ہی سنجیدگی سے بولی۔ "اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم اپنی رُوح کو اس مادّی اور فانی جسم سے جدا کر کے حق تعالےٰ سے ناطہ جوڑنا چاہتے ہو یا کسی بھٹکتی ہوئی روح کو قابو میں کرنا چاہتے ہو۔"

مستانی یہ کہہ کر خاموش ہو گئی، اور مجھے الجھن میں ڈال دیا۔

میرا فیصلہ

مستانی کی طبیعت عجیب نوعیت کی تھی۔ وہ گفتگو کا آغاز بلا سوچے سمجھے کر دیا کرتی تھی۔ خواہ موضوع کوئی ہی ہو وہ بلا تکان بولے چلی جاتی تھی۔ اس کی بات نہایت ہی جامع اور مدلل ہوا کرتی تھی۔ مادیت سے لے کر روحانیت تک اس کے پاس علم کا بیش بہا خزانہ تھا۔ لیکن اس کا طریقہ درس کچھ عجیب سا تھا۔ وہ اپنی بات کا آغاز کہیں سے بھی کر دیتی اور پھر مختلف پہلوؤں کو بیان کرتی ہوئی مجھے کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور بتا دیتی جو میرے لیے فائدہ مند ہوتی تھی۔ "حق اللہ" اور "اللہ ہو" سے لے کر اب تک میرے ساتھ یہی ہوتا رہا تھا۔ مستانی جب بھی بات کرتی تھی، بے مصرف نہیں کرتی اور اس وقت —— اس وقت تو اس نے موضوع ہی ایسا شروع کر رکھا تھا۔ جس کے بارے میں مجھے شروع ہی سے جستجو تھی۔

لیکن اب اس نے موضوع کا تمام نچوڑ نکالنے کے بعد فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ نہایت ہی مشکل کام تھا۔ میرے سامنے اس نے رُوح کی دونوں حقیقتیں بیان کر دی تھیں۔ اب مجھے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میں خاموش تھا۔ مستانی بھی خاموش تھی۔ اسے میرے فیصلے کا انتظار تھا۔

اس طرح تقریباً دس پندرہ منٹ گزر گئے۔

"چاندے .... اور مونگے!" اس نے مجھے سوچ میں گم دیکھا تو پوچھا۔ "اس طرح شاید تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔" اس نے کہا اور میرا جواب پانے سے پہلے ہی کھانا پکانے

والے کونے کی طرف چلی گئی۔ میں نے پیچھے بیٹھے گردن گھما کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ مستانی میرے بیٹھی میرے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ لہٰذا، اب وہ چولہا جلائے گی۔ لیکن چولہا جل رہا تھا اور اس پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی اُبل رہا تھا۔ وہاں پہلے ہی ایک دوسری مستانی بیٹھی چائے بنانے میں مصروف تھی۔ اور پھر وہ مستانی جو میرے پاس سے اٹھ گئی تھی اس بیٹھی ہوئی مستانی کے جسم میں اس طرح سے سما گئی کہ وہ اب ایک ہی معلوم دے رہی تھی۔ مستانی کا دوسرا وجود میرے لیے باعث حیرت تھا۔ ایک بار پہلے بھی مجھے اس ہی قسم کا مشاہدہ ہو چکا تھا۔

مستانی کا دوسرا وجود...... کیا وہ ... اس کی روح ہے، میں نے سوچا کہ کیا......

مستانی کو اپنی روح پر قابو ہے! ہاں ـــ یہی بات ہے، میرے دل نے تائید کی، جب ہی اَن دیکھی دنیا کی سیر کرتی ہے۔ جب ہی تو وہ ذاتِ الٰہی کے حضور میں سرخرو ہے۔ جب ہی تو ہر کام اس کے لیے آسان ہے۔ وقت اور زمانہ اس کے قدموں سے لپٹ کر چلتا ہے۔ مادی اور غیر مادی اشیاء اس کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ اور پھر... پھر... میں نے فیصلہ کر لیا۔

مستانی مٹی کے دو پیالوں میں بغیر دودھ کی چائے لے کر آئی۔ اس نے ایک پیالہ مجھے دے دیا۔ اور دوسرا پیالہ ہاتھ میں لیے ہوئے۔ پھر تکیہ کے سہارے پہلے ہی کی طرح بیٹھ گئی۔

"اگر میں اپنی روح پر قابو حاصل کر لوں، اُسے اپنے تابع بنا لوں تو......؟ میں نے پوچھا۔

"تو... بہت ہی جلد، تمہارا حق تعالےٰ سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔ میرا محبوب تمہیں کون سی سند سے نوازے گا مجھے اس کا علم نہیں۔" مستانی نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن تم اس کے محبوب ضرور ہو جاؤ گے۔ اور جو اس کا محبوب ہوتا ہے، جس پر اس کی رحمت کا سایہ ہو جائے یہ دنیا اس کی ٹھوکروں میں ہوتی ہے۔"

"تو ـــ پھر تم مجھے، اپنی ہی روح کا تابع بنا دو ـــ مجھے اپنی ہی روح پر قابض کر دو۔" میں

نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مبارک ہو خان! مبارک ہو!..." وہ والہانہ خوشی سے بولی۔ "یہ میرے محبوب کا کرم ہے کہ اس نے تمہارے دماغ میں یہ بات ڈالی۔ تم نے بیچ ہی ایسی دنیا کا انتخاب کیا ہے جس کے سامنے اس جیسی ہزار دنیائیں بھی ہیچ ہیں۔ تم نے یہ فیصلہ کر کے میرے شریکِ حیات بننے کا حق ادا کر دیا ہے۔"

"شریکِ حیات...؟" میں نے اس کے آخری جملہ پر چونک کر کہا

"خان!" وہ اس ہی طرح والہانہ خوشی سے بولی۔ "تو نے ثابت کر دیا ہے، تجھے مجھ سے سچا عشق ہے اور میرے محبوب کا منشا ہے کہ میں ابدی زندگی کے لیے بھی ایک ایسا ساتھی چن لوں جو وہاں میرے ساتھ رہ سکے۔"

مستانی کی یہ بات سن کر شریکِ حیات والی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مستانی کے کہنے کے مطابق اس نے مجھے ابدی حیات کے لیے چن لیا تھا۔

مستانی کے اس فیصلہ سے مجھے خوشی ہوئی۔ اللہ کی مستانی، ذاتِ الٰہی کی دیوانی میری ہو جائے گی۔ خدا کی طرف سے عطا کی گئی اس نعمت پر میں جتنا بھی چاہتا ناز کرتا لیکن نہیں۔ میرا نفس میرے قابو میں تھا۔ میں نے اس نعمت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بس خوشی کی ایک لہر آئی اور گزر گئی۔

"لیکن خان!" مستانی ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "یہ نفس بڑا ہی فتنہ پرور ہے۔"

"نفس کی کیا بات ہے!" میں نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ "میں نے نفس کو مار دیا ہے۔"

"نفس مرتا نہیں خان۔" وہ سپاٹ لہجہ میں بولی۔ "یہ تو انسان کو مار سکتا ہے۔"

"کیا مطلب!" میں نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ انسان جب تک زندہ رہتا ہے یہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔" اس

نے جواب دیا" اور ابھی ہم دونوں میں سے کسی کا یہ وقت نہیں آیا کہ ابلیس کی اس آماجگاہ سے چھٹکارا حاصل کریں۔"

"لیکن، میں تو موت سے پہلے ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر چکا" میں نے بڑے ہی اعتماد سے کہا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا پھر خود ہی بولی "انسان عرفان و آگہی کی کسی بھی منزل پر پہنچ جائے، یہ اُسے صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور پھر جو لوگ ذاتِ الٰہی کا قرب چاہتے ہیں ان کا تو یہ خاص کر دشمن ہو جاتا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو" میں نے وضاحت چاہی۔

"میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ کہیں تم اس شیطان کے بہکانے میں نہ آجاؤ۔ کیوں کہ تم نے حق تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے جو راہ منتخب کی ہے اس پر یہ ظالم تمہیں قدم قدم پر بہکائے گا۔"

"تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیئے" میں نے اسے تسلّی دی۔

"مجھے تم پر بھروسہ ہے" مستانی نے مسکرا کر جواب دیا "لیکن، اس ظالم کی کارستانیوں سے بھی خوب واقف ہوں۔ اس بدبخت کی بدولت کئی زاہد راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں۔"

"تم بے فکر رہو، اب یہ میرے قابو میں ہے" میں نے کہا۔

"مجھے فکر اس بات کی ہے کہ تم مرد ہو" مستانی بولی "اور یہ بدبخت مرد کو بہت ہی جلد بے قابو کر دیتا ہے" پھر وہ قدرے فکرمندی سے بولی۔ "اور جس مرد کے پاس ماورائی طاقت ہوتی ہے اُسے تو یہ ٹکنے ہی نہیں دیتا۔"

"لیکن، جب میں اس بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھوں گا تو، پھر....؟" میں

نے جیسے پوچھا۔

"ہاں، اگر تم نے رُوح پر قابو پانے کے بعد بھی نفس کو بے قابو نہیں ہونے دیا تو پھر باآسانی قربِ الٰہی حاصل کر لو گے لیکن، یاد رکھو!" وہ انگلی اٹھا کر بولی "اگر اس دوران تم سے ذرا سی بھی لغزش ہو گئی تو پھر... تم زندگی بھر پچھتاتے رہو گے۔"

"مجھے خود پر بھروسہ ہے" میں نے پُرعزم انداز میں کہا "لیکن پھر بھی اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوئی تو... تم ساتھ ہو نا"

"ہاں، جب تک میں ساتھ ہوں شاید یہ تم پر قابو نہ پا سکے" وہ خلاء میں دیکھتے ہوئے بولی "لیکن میں بھی کب تک ساتھ ہوں..... میری منزل قریب ہے اور تم منزل سے دور ہو" پھر وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "عرفان! روح کو تابع کر لینے کے بعد تم روحانیت کا ایک مرحلہ طے کر لو گے، تم کس حد تک ماورائی طاقتوں کے مالک ہو جاؤ گے۔ پھر.... پھر.. تمہیں سخت آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔ اور اگر تم نے ثابت قدمی سے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا تو پھر تم "پردۂ حجاب" کے قریب پہنچ جاؤ گے۔ تمہارے اور ذاتِ الٰہی کے درمیان صرف یہی ایک چیز رہ جائے گی۔"

"اللہ مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے!" بے ساختہ میرے منہ سے دعائیہ کلمہ نکلا۔

"آمین!" مستانی نے جواب میں کہا۔ پھر تکیہ سے اٹھتے ہوئے بولی "میں بھی چاہتی ہوں کہ تم جلد از جلد منزل تک پہنچ جاؤ" پھر پلنگ سے اُٹھتے ہوئے بولی "وقت گزرتا جا رہا ہے، نماز پڑھ لو"

یہ سن کر میں بھی ساتھ ہی اٹھ گیا۔

مستانی نے مجھے ایک آسن بتایا۔ اس خاص آسن کے طریقے سے میں "حق اللہ" کی ضرب کے ساتھ سانس کی مشق کرنے لگا۔

جب میں اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر "حق اللہ" کے قاف کے ساتھ سانس روکتا تھا تو بڑی دشواری ہوتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اپنی دشواری پر قابو پاتا چلا گیا۔ میں 'حق' کے ساتھ سانس اندر لیتا تھا اور 'اللہ' کے ساتھ خارج کرتا تھا۔ اس طریقے سے میں حق اللہ کے قاف کے ساتھ سانس کھینچ کر جتنی دیر چاہتا اپنے جسم میں روکے رکھتا اور اسی طرح 'اللہ' کی ہ کے ساتھ جتنی دیر چاہتا باہر رکھتا۔ اس طریقے سے مجھے اپنی سانس پر اختیار حاصل ہوتا چلا گیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنی حقیقت کو پا لیا۔ یہ گوشت پوست کا جسم اب میرے لیے محض ایک لباس کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں جب بھی چاہتا خود کو اس لباس سے آزاد کر لیتا اور پھر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا۔ وہ دنیا کیا تھی، کیسی تھی — میرا قلم بیان نہیں کر سکتا۔

اُس دنیا میں پہنچنے کے بعد میرا دل واپس آنے کو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً واپس آنا پڑتا تھا کیونکہ ابھی میں نے موت کا ذائقہ نہیں چکھا تھا اور اس دنیا میں موت کا ذائقہ چکھے بغیر رہا نہیں جا سکتا تھا۔

اب یہ دنیا میرے لیے مٹی کا ڈھیر تھی۔ مجھے موت کی تمنا تو تھی۔ لیکن وہ مجھ سے بہت دور تھی۔

دیدۂ بینا

میری ہیئت بالکل ہی بدل چکی تھی۔ سر کے بال عورتوں کی مانند لمبے ہو چکے تھے۔ داڑھی سینے تک آ چکی تھی۔ لباس نہایت ہی گندا اور بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اب بھلا مجھے اس فانی جسم کی پرواہ کیوں ہوتی۔ میں تو زیادہ سے زیادہ مظاہرِ قدرت دیکھنے میں گزارہ کرتا تھا۔ اس کائنات کے ذرّے ذرّے میں نورِ الٰہی پنہاں ہے۔ پانی کے قطرے سے لے کر آتش فشاں تک اس کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں۔

اس مشاہدے سے مجھ پر بے خودی سی طاری رہتی تھی۔ محویت کی اس کیفیت میں بے ساختہ میری زبان سے ذاتِ الٰہی کی تعریف میں کلمات نکلتے تھے۔ اب میں خود ایک مجذوب تھا جسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا، جو ہر وقت جذب و مستی کی حالت میں "حق اللہ" اور "اللہ ہو" کی صدا لگاتا رہتا تھا۔

میں خود اپنی دنیا میں گم تھا۔

ایک دن نہ جانے کس طرح میں اپنی دھن میں مگن شہر کی جانب نکل گیا۔

سڑکوں پر چلتے ہوئے انسان مجھے ڈھیلے نظر آتے تھے جنہیں میں آسانی سے پیروں تلے روند سکتا تھا۔ کچھ لوگوں نے میری طرف حقارت سے دیکھا بھی۔ کچھ لوگ مجھ سے کترا کر نکل گئے کیونکہ میں ان کی نظروں میں پاگل تھا۔ چند بچوں نے مجھے ستانے کی خاطر پتھر بھی پھینکے لیکن میں اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ مجھے کہاں جانا تھا، کیوں جا رہا تھا مجھے کچھ پتہ

نہیں تھا۔ بس میں یوں ہی چلا جا رہا تھا کہ اچانک شاہد سے میرا سامنا ہو گیا۔

شاہد ایک دکان سے پان لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں رک گیا جیسے زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ خونی رشتہ کا پیار ابھر آیا۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پہچان لے گا لیکن اس حلیہ میں بھلا وہ مجھے کیا پہچان سکتا تھا۔

اس نے پان منہ میں رکھا اور جانے کو مڑ گیا۔ اس کی یہ بے رخی دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔

میں نے اسے آواز دی۔

آواز سنتے ہی اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اور ٹھٹک کر رک گیا۔ میں خوشی میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا میرا خیال تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ لیکن جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا، وہ نہایت رو کھے پن سے بولا "بابا جی تم میرا نام جانتے ہو۔ لیکن میں ایسے شعبدوں میں آنے والا نہیں۔"

میں شاہد کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اس کا خالہ زاد بھائی ہوں۔ لیکن اس نے ایک دم میری حیثیت کو چیلنج کر دیا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے پہچانا ہی نہیں تھا۔ اس کی نظر میں ایک شعبدہ باز ہی ہو سکتا تھا۔ میرے دل میں تو آیا کہ شاہد کو اس گستاخی کا مزا چکھا دوں لیکن دوسرے ہی لمحہ میں نے خود پر قابو پا لیا اور اپنی حیثیت کا رعب جمانے کی خاطر بولا۔ بچے! میں صرف تمہارا نہیں، تمہارے ماں باپ اور بہن کا نام بھی جانتا ہوں۔"

"اگر جانتے ہو تو بتاؤ۔" شاہد نے مجھے چڑا کر کہا۔

میں نے خالہ، خالو اور رانی کے نام بتا دیئے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا کہ اس کا باپ کیا کام کرتا ہے۔

شاہد میرے اس انکشاف سے حیران رہ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور خوشامد سے بولا "بابا جی! اگر آپ کچھ ہیں تو میری بیوی کا علاج کر دیجئے نا!"

"کیا ہوا تیری بیوی کو؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

ویسے مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس عرصہ میں شاہد کی شادی ہو چکی ہے اور میری ہنسی اس ہی خوشی میں نکلی تھی۔

"اُسے دورے پڑتے ہیں بابا جی!" شاہد اُداسی سے بولا۔ "اولاد بھی نہیں ہوتی کہتے ہیں اس کی کوکھ باندھ دی ہے۔"

"اور تیری بہن کا کیا حال ہے؟" میں نے یوں ہی پوچھا۔

شاہد میرے اس سوال پر حیران رہ گیا۔ اس کے خیال میں مجھے اس کی بہن کا حال معلوم تھا۔

وہ نہایت ہی رازداری سے بولا "بابا جی! اب آپ سے کیا چھپانا، اس کی شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں۔ اس کے بھی اولاد نہیں ہوئی۔"

مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ رانی کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گردن جھکا کر اپنے سینے پر نظریں گاڑ دیں اور چند ہی لمحوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ان دونوں پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے۔

"ہونہہ! دونوں ایک ہی عذاب میں مبتلا ہیں۔" میں بڑبڑایا۔

"چلو بابا جی، گھر چلو۔" شاہد نے میرا بازو پکڑ کر چلنے کو کہا۔

دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا لیکن مجھے اس کی بیوی اور بہن پر سے جادو کا اثر ختم کرنا تھا۔ جس کے لیے مجھے تنہائی درکار تھی۔ میں یہ کام اس کے گھر والوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولا۔ "نہیں بیٹا نہیں۔ ہم کسی کے گھر نہیں جاتے۔ تم جاؤ، ہم دعا کریں گے۔"

میں نے دیکھا شاہد کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ وہ مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہوئے چل دیا۔ اس کی نظروں میں کوئی یوں ہی سا ملنگ تھا۔

میں دو منٹوں میں واپس کوٹھری میں چلا گیا۔

میں نہایت ہی جلالی کیفیت میں مصلے پر بیٹھا حق اللہ کی ضرب لگا رہا تھا۔ مستانی کچھ پکانے میں مصروف تھی لیکن اس کی نگاہیں بدستور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ضرب لگانا بند کر دیا۔ اور غصہ کے عالم میں ایک وظیفہ پڑھنے لگا اس کی یہ خاصیت تھی کہ میں ذہن میں جس کا تصور کرتا، وہ سامنے آجاتا۔ اور اس وقت میرے ذہن میں اس شخص کا تصور تھا جس نے شاہد کی بیوی اور اس کی بہن کو اولاد سے محروم کر رکھا تھا۔ میں نے اس شخص ہی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی میں نے وظیفہ کے چند الفاظ ہی دہرائے ہوں گے کہ میرے سامنے دھواں سا پھیل گیا۔ اور اس دھوئیں میں ایک پنڈت کی شبیہ ابھری۔ وہ ایک ٹانگ پر کھڑا مالا جپ رہا تھا۔ ابھی اس کے خدوخال اچھی طرح نمایاں بھی نہ ہو پائے تھے کہ میں نے اسے نفرت اور حقارت سے دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، مستانی تیزی سے میری طرف آتے ہوئے بولی "نہیں، خان! — نہیں"

"اس نے میرے بھائی کو ستا رکھا ہے" میں نے نفرت سے اس شبیہ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ جو درمیان میں وظیفہ چھوڑ دینے سے دھندلا گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں" مستانی نے بالکل میرے قریب کھڑے ہو کر کہا۔

"یہ سمجھتا کیا ہے!" میں نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔

"خبردار" مستانی تقریباً چلا اٹھی۔ پھر اس نے نہایت پھرتی سے میرا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور نہایت ہی نرم لہجہ میں بولی "خان! درگزر کرنا بہادروں کی شان ہے! اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"

ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے مزاج میں نرمی آگئی۔ مستانی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی میں بیمار ہوں، جیسے واقعی میں کوئی غلطی کر رہا تھا۔

دھوئیں کا بادل ایک بار پھر سمٹا۔ اور اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے ایک جھرجھری سی لی اور مستانی کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے خان، تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے تھے؟" اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر پوچھا۔

میں نے مستانی کے چہرے پر وظیفے کی پھونک ماری اور بولا "آج میں شہر چلا گیا تھا"

"اور وہیں تمہاری ملاقات شاہد سے ہو گئی" مستانی نے میری بات کاٹ کر کہا "اس نے اپنا دکھڑا سنایا، اور تم آپے سے باہر ہو گئے"

"ہاں یہی بات تھی" میں نے اس کی تائید کی۔

"میں اسی وجہ سے تمہیں شہر نہیں جانے دیتی ہوں" مستانی پیار بھرے لہجے میں بولی "وہاں دکھ ہی دکھ ہے"

"لیکن، ان دکھوں کو دور کرنا بھی تو ہمارا کام ہے" میں نے جیسے پوچھا۔

"ابھی تمہیں یہ کام نہیں سونپا گیا ہے" مستانی نے مسکرا کر جواب دیا "اور ...."

"لیکن، مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تمہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا ہے خان" اس نے سمجھایا "تمہیں دنیا والوں کی مصیبتیں دیکھ کر دل پر جبر کرنا ہے، اس وقت تک جب تک مشیت ایزدی نہ حاصل ہو جائے" پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں جانتی ہوں اس شہر میں ایک باطل قوتوں کا مالک بھی ہے"

"تو پھر، کیوں نہ اس باطل کا سر کچل دیا جائے، کیوں نہ اسے ختم کر دیا جائے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"تم میں مارنے کی قوت ہے خان!" اس نے ہنس کر پوچھا۔ اور میں لاجواب ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔

اس نے نہایت پیار بھرے لہجے میں کہا: "مارنا اور جلانا، یہ کام تو خدا کا ہے خان، ہمارا کام تو صرف دکھوں کو دور کرنا ہے۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کیا چاہتے ہو، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" اس نے میرے رویّہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بات سمجھ لو کہ ہم دکھوں کو بھی منشائے الٰہی کے بغیر دور نہیں کر سکتے۔" پھر سمجھاتے ہوئے بولی: "اور تم ابھی اس مقام پر نہیں پہنچے ہو جہاں یہ ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔" مستانی نے صاف الفاظ میں مجھے میری حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔ "ابھی تو تم اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے ہو۔" اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "ابھی تمہاری حیثیت کشتی میں سوار اس ملاح کی سی ہے جسے صرف چپّو چلانا ہی آتا ہے۔ جس کی کشتی کو تیز و تند موجیں جدھر چاہیں لے جا سکتی ہیں، جو صرف ہواؤں کا محتاج ہوتا ہے۔ اور ہوائیں منزل سے دور بھی کر دیتی ہیں۔" پھر اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا: "تم اس وقت منجدھار میں ہو، روحانیت کا بے کراں سمندر تمہارے سامنے ہے، تمہیں سمندر کو پار کرنا ہے، تمہیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ جیسے اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لی جیسے خواب سے بیدار ہوا ہوں۔ غصّہ کی حالت میں مجھ سے جو کچھ ہوا اس پر مجھے ندامت تھی۔

"میں نے مکئی کی روٹی پکائی ہے۔ کھاؤ گے؟" مستانی نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے خاموشی سے اقرار کے انداز میں گردن ہلا دی۔ وہ میرے پاس سے اٹھ کر کھانے پکانے والے کونے کی طرف چل دی۔

حالات بدل گئے

اس واقعہ کے بعد مستانی نے سختی سے میرے اوپر شہر جانے کی پابندی عائد کر دی۔ اس کا خیال تھا انسانوں کو مصیبتوں میں دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اور میرے پاس جو معمولی سی ماورائی طاقتیں ہیں، میں ان ہی کے سہارے تمام مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے پر تیار ہو جاتا ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں نے اس طرح کی کوئی بھی حرکت کر دی تو میری موجودہ صلاحیت بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

اس نے روح کو جسم سے جدا کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی تھی۔ کیونکہ اس طرح بھی اسے میرے بھٹک جانے کا اندیشہ تھا۔ بہرحال، اب میں جیکب تالاب تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

اس عرصہ میں اچانک ہی بابا جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ مجھے ان کے انتقال کا بہت افسوس تھا لیکن مستانی کا کہنا تھا کہ اب بابا جی اس سے بہتر جگہ پر ہیں۔

بابا جی کے انتقال کے بعد مستانی نے بھی شہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ انتہائی ضرورت کے تحت بازار جاتی تھی۔ اور وہ بھی گھنٹہ، آدھا گھنٹہ میں واپس آجاتی تھی۔

اس واقعہ کے کوئی تین ماہ بعد، جب کہ مستانی شہر گئی ہوئی تھی، میں ظہر کی نماز پڑھ کر اٹھا تو گرمی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ تالاب کے کنارے بیٹھ کر نہاؤں۔ اس خیال سے کوٹھری کے دروازے کی جانب مڑا۔ ابھی میں نے کوٹھری کے باہر قدم بھی نہیں رکھا

تھا کہ دیکھا وہی پنڈت ہاتھ میں مالا لیے دروازہ پر کھڑا ہے۔ جسے میں تین ماہ قبل چشمِ تصور سے دیکھ چکا تھا۔ اسے اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

"مہمان کو اندر آنے دو۔" مجھے مستانی کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر کونے کی طرف دیکھا جہاں مستانی مصلّے پر بیٹھی دروازہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے خیال میں میں نے پنڈت کا راستہ روک رکھا تھا۔ مستانی کی اس اچانک آمد سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں دروازے سے ہٹ کر تیزی سے اس کے پاس آیا اور پوچھا "تم کب آئیں، کیسے آئیں اور یہ کون ہے۔۔۔؟"

"تمہیں خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" مستانی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں پنڈت ایک قدم دہلیز کے اندر رکھ چکا تھا۔

"آؤ، پنڈت جی آؤ۔" مستانی نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے سر کا رومال کھول کر بیٹھنے کے لیے مصلّے کے پاس ہی بچھا دیا۔

پنڈت نے کوٹھری میں داخل ہو کر چاروں جانب نظر دوڑائی۔ پھر وہ مستانی کے بچھائے ہوئے سبز رومال کے قریب کھڑا ہو کر بولا "تیرے پتا کا دیہانت ہوئے دن بیت گئے لیکن تو نے مجھے خبر تک نہ دی۔"

"پنڈت جی!" مستانی مسکرا کر بولی "یہ دنیا فانی ہے، فانی شئے کا کیا غم کرنا، کیا کسی کو بتانا! جو اس جہان میں آیا ہے وہ تو جائے گا ہی!"

"کہتی تو ٹھیک ہی ہے پر دنیاداری بھی تو کوئی چیز ہے!" اس نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

"دنیاداری۔۔۔ دنیا والوں کے لیے ہوتی ہے۔" مستانی نے طنز کیا۔ "ہم مٹی کے لوگوں کے لیے اس میں کیا رکھا ہے!"

"جبھی تو میں چاہتا ہوں۔" وہ شرارت آمیز تبسم سے بولا۔ "کہ مٹی کے شریر کو تیا

کے شریر سے مل جانا چاہیے۔ ہم دونوں کا ملاپ دو پاک روحوں کا ملاپ ہوگا۔"

پنڈت کے اس جملے سے میں چونک پڑا۔ اس جملے کی غرض و غایت سے میں واقف تھا۔ میرے سامنے آٹھ سال پہلے کا سکھ دیو کھڑا تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ہٹا کٹا مشٹنڈا ہوتا تھا لیکن اب وہ جسمانی لحاظ سے بالکل بدل چکا تھا۔ اس کا جسم ڈھلک چکا تھا اور گوشت کی جگہ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ اس کے سر پر چوٹیا کی جگہ لمبے لمبے بال تھے جو شانوں پر جٹاؤں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور ان میں آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ بوڑھاپا دبے قدموں اس پر چھاتا جا رہا تھا۔

"سکھ دیو۔" مستانی نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ شاید وہ میرے بیانات کو جان چکی تھی اور اب مزید مجھے شک و شبہ میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ "میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ آپ کی خواہش کا احترام کرتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہمارا ملاپ اسی وقت ممکن ہے کہ آپ اپنا دین چھوڑ دیں۔"

"کیسی بالکوں جیسی باتیں کرتی ہے۔" سکھ دیو نے اسے سمجھایا۔ "ہمارے لیے دھرم کیا ہے، ہم دونوں ہی بھگوان کے سیوک ہیں۔"

"جب ہی تو میں کہتی ہوں کہ اپنا دین آپ چھوڑ دیں۔" مستانی نے بھرپور وار کیا۔

سکھ دیو مستانی کی اس بات سے کچھ دیر کے لیے شش و پنج میں پڑ گیا۔ پھر وہ گہری سوچ سے بولا۔ "تیری خاطر میں یہ بھی کر سکتا تھا، لیکن میں جو کچھ ہوں اپنے دھرم کی بدولت ہوں۔"

"میرے دین میں اگر آپ کو اس سے بھی زیادہ مل سکتا ہے۔" مستانی نے اسے سمجھایا۔ "وہ آپ کو اور زیادہ نواز سکتا ہے....."

"نہیں نہیں، مجھے جو حاصل کرنا تھا کر لیا۔" اس نے جواب دیا۔ "اس سے زیادہ بھگوان اور کیا دے سکتا ہے۔" پھر اپنے سر کو خفیف سا ایک جھٹکا دے کر بے خودی سے بولا۔ "اس سے زیادہ بھگوان اور کیا نواز سکتا ہے۔ میں نے جو چاہا مل گیا۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" پھر وہ مستانی

سے مخاطب ہوا۔ "تو نہیں جانتی، میرے دھرم کے لوگ مجھے کتنا مانتے ہیں، کتنا چاہتے ہیں۔"

"تیری یہی انا تجھے لے ڈوبے گی۔" مستانی نے ذرا خفگی کے انداز میں کہا۔

"اس شریر میں صرف یہی ایک چیز میرے پاس رہ گئی ہے۔" وہ عیاری سے بولا۔ "میرے بیاکل من کو صرف اسی سے شانتی ملتی ہے، ورنہ تو تو جانتی ہے کہ میں خود فنا ہو چکا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اچانک اس کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ شاید اسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ لہٰذا تیوری پر بل ڈال کر مستانی سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"اللہ کا بندہ ہے۔" مستانی نے بالکل نپا تلا جواب دیا۔

"شاید۔ میں نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے۔" سکھ دیو بڑبڑایا۔ اور اپنی سرخ انگارہ جیسی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نگاہیں میرے جسم میں گھسی جا رہی ہوں۔

مستانی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہوں... تو، تو وہی ہے۔" سکھ دیو جیسے مجھے پہچان گیا۔ "تو نے ہی میرے جاپ میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔" وہ غرایا۔

"بیٹھ جائیے پنڈت جی۔" مستانی سکھ دیو کا مطلب سمجھ چکی تھی اور اب وہ اسے بہلانا چاہتی تھی۔ "آپ دور سے آئے ہیں۔ مجھے باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔"

"میں یہاں اپنا سواگت کرانے نہیں آیا ہوں۔" وہ جارحانہ لہجے میں بولا۔ "مجھے جس گستاخ کی تلاش تھی....."

"چھوڑیئے پنڈت جی۔" مستانی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہ آپ جیسی شخصیت کے شایانِ شان نہیں ہے۔"

"تو کہتی ہے تو چھوڑے دیتا ہوں۔" وہ نہایت ہی غرور سے بولا۔ "لیکن اسے سمجھا دے یہ تمیز نہ لگے"

"بچہ ہے۔" مستانی ہنس کر بولی۔ "اور بچوں کی غلطیوں پر دھیان نہیں دیا جاتا۔"

گویا مستانی نے یہ بات سکھ دیو سے کہی تھی لیکن اس میں میرے لیے بھی سرزنش تھی۔

"میں بھی تو کہوں!" وہ آنکھیں چمکا کر بولا "اس دھرتی پر کون ہے جو میرے آڑے آرہا ہے پھر اس نے مستانی کو بتایا کہ تین ماہ پہلے جب میں ایک جاپ کر رہا تھا تو مجھے جھٹکے سے لگے۔ میں نے سوچا کہ اس دھرتی پر کون ایسی مہان شکتی والا ہے۔ میرا خیال تھا وہ تو ہی ہو سکتی ہے لیکن مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ تو ایسی اوچھی حرکت کرنے والی نہیں ہے۔"

پھر وہ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "اگر میں کنڈل سے باہر ہوتا تو یہ بے وقوف پکھ نہ کچھ کر گزرتا۔"

اس کی یہ بات سن کر اب میری سمجھ میں آیا کہ تین ماہ قبل وظیفہ پڑھنے سے جو دھندلائی شکل ابھری تھی وہ اسی سکھ دیو کی تھی۔ اور حصار میں ہونے کی وجہ سے اس کی صحیح شکل سامنے نہیں آسکی تھی۔

"چھوڑیے، گئی گزری بات کی شکایت کیا کرنا!" مستانی نے مسکرا کر جواب دیا "لیجیے، کچھ کھا لیجیے!" کے ساتھ ہی میں نے مستانی کے ہاتھوں میں پھلوں سے بھری ہوئی تھالی دیکھی جسے اس نے سکھ دیو کے سامنے کر دیا۔

"میں شکایت کرنے نہیں آیا ہوں!" وہ اسی طرح غرور سے بولا "تو اسے سمجھا دے۔ اگر یہ اللہ والا ہے تو میں بھی بھگوان کا پجاری ہوں۔ اگر یہ کچھ جانتا ہے تو میں بھی خالی ہاتھ نہیں ہوں!"

سکھ دیو کی یہ بات میرے لیے چیلنج تھی بلکہ میرے ہی لیے نہیں، مستانی کے لیے بھی چیلنج تھی۔ میرا خیال تھا کہ مستانی اس کا کوئی ٹھوس جواب دے گی لیکن وہ بدستور ضبط سے کام لے رہی تھی۔

"آپ کیا ہیں، میں جانتی ہوں!" مستانی نے چھپا ہوا طنز کیا "آپ کی حیثیت کیا ہے اسے بھی بتا دوں گی لیکن کچھ کھا تو لیجیے!" مستانی نے مسکرا کر تھالی کی جانب آنکھ سے اشارہ کیا۔

"میں بھوکا نہیں ہوں!" سکھ دیو نے روکھے پن سے کہا۔ شاید وہ مستانی کا طنز سمجھ

گیا تھا "میری آتما بھوکی نہیں ہے!" اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس طرح سے ہاتھ اٹھایا کہ مستانی کے ہاتھ سے پھلوں کی بھری ہوئی تھالی دور جا پڑی۔ مستانی کے چہرے پر اس غیر متوقع حرکت سے ناگواری کی لہر پیدا ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ درگزر کے انداز میں بولی "افسوس۔ بھگوان کا پجاری بھگوان کی نعمتوں کو ٹھکرا رہا ہے!"

"اگر تجھے اس کا قلق ہوا ہے تو یہ لے!" سکھ دیو اپنی حرکت پر شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے بولا۔

اور پھر ان الفاظ کے ساتھ ہی زمین پر بکھرے ہوئے پھل خود بخود تھالی میں آگئے۔

"پنڈت جی! آپ اپنی طاقت کو انسانوں کی بھلائی میں کیوں نہیں صرف کرتے؟" مستانی نے شاید اس کی کرامت سے متاثر ہو کر کہا۔

"بھلائی۔!" اس نے نہایت ہی کراہت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اگر تو پاپ اور پُن کو جانتی ہے تو چپ رہ۔ انسان کی بھلائی کے لیے کیا کرنا چاہیے یہ میں جانتا ہوں!"

"اگر تم جانتے ہوتے تو یہ بات نہ ہوتی!" میں نے پہلی بار ان دونوں کی گفتگو میں مداخلت کی۔

دراصل اس کا جارحانہ انداز میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میری بات سنتے ہی وہ سانپ کی طرح پلٹا اور حقارت آمیز لہجہ میں بولا "چھوکرے اپنی اوقات میں رہ میرے منہ نہ لگ۔ تو نہیں جانتا کہ کس سے بات کر رہا ہے!"

"سکھ دیو۔!" مستانی نے اسے سخت لہجہ میں مخاطب کیا لیکن وہ جیسے ہی اس کی جانب مڑا، وہ نہایت میٹھے لہجے میں بولی "خدا کی ذات سب سے بڑی ہے۔ وہی قادرِ مطلق ہے!"

"مجھے اس سے انکار نہیں!" سکھ دیو سنبھلا "لیکن اس کی طرح کے چند لوگ!" اس نے میری جانب اشارہ کر کے کہا "اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنے لگتے ہیں!"

"نہیں، نہیں غرور کرنا انسان کو زیب نہیں دیتا" مستانی نے بات ہی پر گویا اُلٹ دی "یہ طاقت انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے طاقت کا نشہ سب سے بُرا نشہ ہے۔ انسان کو اس نشہ میں اپنا ہوش ہی نہیں رہتا"

"تو اپنے جینے کو سمجھا" سکھ دیو نے طنزیہ ہنس کر کہا "ہوش میں رہے۔ مجھ سے ٹکرانا اچھا نہیں تب وہ؟" "جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو نتیجہ سوائے بربادی کے کچھ نہیں نکلتا" مستانی نے جواب دیا۔

"تو مجھے سبق پڑھا رہی ہے" سکھ دیو نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

"نہیں، میں تو تمہیں وہ بات بتا رہی ہوں جسے تم ابھی تک نہیں سمجھے" مستانی نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں کیا سمجھتا ہوں اور کیا نہیں، اس کی تجھے چنتا کرنے کی ضرورت نہیں" اس نے کھسیا کر جواب دیا۔ اور سر جھٹکتا ہوا کوٹھری کے باہر نکل گیا۔

"یہی باطل قوتوں کا مالک سکھ دیو ہے جس سے آج تم اچھی طرح واقف ہو چکے ہو" مستانی نے جتایا۔

"میں جانتا ہوں اور اس ہی لیے میں نے کہا تھا کہ باطل کا سر کچل دینا چاہیے" میں نے کسی قدر غصہ سے کہا۔

"کسی کو ختم کرنا خدا کا کام ہے" مستانی نے مجھے سمجھایا "جو اس زمین پر آیا ہے اللہ کی منشا سے آیا ہے۔ وہ اپنی تقدیر کا لکھا پورا کر رہا ہے، ہمیں اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرنا ہے"

یہ کہہ کر اس نے مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ جب میں قریب پہنچا تو اس نے میرے چہرے اور سر پر پھونک ماری میرے دماغ میں سکھ دیو کے خلاف جو باتیں تھیں وہ ایک دم ختم ہو گئیں۔ میرا دماغ پھر پہلے کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔

"خان!" وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولی "اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ۔ اب تمہاری کشتی کو تلاطم سے نکل جانا چاہیے کیونکہ میری کشتی کنارے

لگنے والی ہے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں ساحل پر اتروں، تمہیں راستہ بتا دینا میرا فرض ہے۔ کیوں کہ تم میرے شریکِ حیات ہو، ابدی دُنیا کے ساتھی ہو"

یہ کہہ کر مستانی نے زور سے "حق اللہ" کا نعرہ لگایا اور۔۔۔ اور اس پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد مستانی نے مجھے ذکرِ الٰہی میں ایسا مشغول کیا مجھے اپنا ہوش ہی نہیں رہا۔

میں نے مستانی کے ساتھ سردیوں کے موسم میں یخ بستہ جھیل تالاب میں سینہ سینہ پانی تک کھڑے ہو کر وظیفے پڑھے جس کا نتیجہ نکلا کہ اب میں سطحِ آب پر بھی زمین کی مانند چل سکتا تھا، بپھرے ہوئے دریا اور سمندر کو انگلی کے اشارے سے پرسکون کر سکتا تھا۔ اور چاہتا تو پرسکون دریا کو طوفانی سمندر میں تبدیل کر سکتا تھا۔

میں جس قدر بھی عرفان و آگہی کی منزلیں طے کرتا تھا، میری نظروں میں مستانی کی قدر و منزلت بڑھتی جاتی تھی۔ مستانی قطب تھی، ولی تھی یا مجذوب میں کبھی نہ جان سکا۔ اس میں تو تمام ماورائی صفات موجود تھیں۔ میں نے اسے فضا میں پرواز کرتے، سطحِ آب پر چلتے اور ایک ہی وقت میں کئی جگہ پر موجود دیکھا۔ یہ باتیں اس کے لیے بہت معمولی تھیں۔ مستانی اس سے بھی کسی بڑے مقام پر فائز تھی۔ اس نے خبیث روحوں کو بلیوں کے جسموں میں قید کر رکھا تھا۔ حوریں اور نیک خواتین کی روحیں اس کی امامت میں نماز ادا کرتی تھیں۔ وہ امام تھی، خلیفہ تھی، نائب تھی اور مخلوقات میں اشرف تھی۔ اس کی زندگی کا ہر سانس احکامِ الٰہی کے تابع تھا، اس کی حرکت مشیت کی پابند تھی۔

میں بتا چکا ہوں کہ سکھ دیو سے ملاقات کے بعد مستانی نے مجھ پر خاص توجہ دینا شروع کر دی تھی اور اب جوں جوں یہ کائنات مسخر ہوتی جا رہی تھی، میں عرفانِ حق کی منزل سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یوں تو مستانی نے مجھے کئی وظیفے بتائے لیکن خاص طور سے آیہ کریمہ کا وظیفہ

پڑھنے کی تاکید کی۔ اس وظیفے کی فضیلت اور برکتیں بیان کرنے کے لیے دفتر چاہیے۔ مستانی کا یقین تھا کہ اس آیتِ مبارک کے مؤکل سے دنیا میں صرف گنتی کے چند آدمیوں ہی کا رابطہ قائم ہو سکا ہے۔ اور وہ بھی اس سے صحیح طریقے سے کام نہ لینے کی بدولت جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ آیۂ کریمہ کی برکتوں سے صرف وہی لوگ فیضیاب ہو سکتے ہیں جو فنافی اللہ کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آیۂ کریمہ کا چلّہ پورا کرنے کے لیے اس نے مجھے ویرانے میں چلے جانے کو کہا۔ اور پھر میں غاروں کی طرف نکل گیا۔ یہاں ایسا ویرانہ تھا کہ جانور تک نظر نہیں آتے تھے۔

ایک دن میں ایک پہاڑی چشمہ کے کنارے بیٹھا وظیفہ میں مشغول تھا کہ یکایک آسمان سے روشنی کی ایک موٹی سی دھار میرے سامنے زمین پر پڑنے لگی۔ میں نے اور تیزی سے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میری نظریں روشنی کی دھار پر جمی ہوئی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس دھار میں ایک سرو قد شکل نمودار ہوئی۔ اس نے سفید دودھیا رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ شکل نمودار ہوتے ہی فضا میں السلام علیکم کی نہایت ہی دل کش آواز بلند ہوئی۔

میں نے سلام کا جواب دیا تو وہ نورانی شکل مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اے بندۂ خدا! کیا چاہتا ہے؟"

میں نے لمحہ بھر سوچا اور پھر بولا "آپ کون ہیں، کیا آپ اپنے بارے میں بتانا مناسب سمجھیں گے؟"

"تو جس مقدس کلام کو عرصہ سے پڑھ رہا ہے میں اس ہی کلام کا مؤکل ہوں"۔ اس نورانی شکل نے اپنا تعارف کرایا۔ "خداوند قدوس کا یہ کلام جس کی تو گردان کرتا ہے، اپنے الفاظ اور معنوں کے ساتھ حق تعالےٰ کے حضور میں مقبول ہے۔ اس کلام کی برکتوں کا میں محافظ ہوں۔ اور ذاتِ الٰہی کی طرف سے مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ جو اس کلام کو مسلسل پڑھتا رہے میں اس پر برکتیں نازل کروں۔ اگر وہ کسی مشکل میں گرفتار ہے تو اس پر سایۂ رحمتِ خداوندی کروں۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نام... اللہ کے غلاموں کے نام نہیں ہوا کرتے"۔ اس نورانی شکل نے جواب دیا۔ "یہ تو دنیا میں پہچان کا ذریعہ ہیں"۔

دنیا کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں عرش کا خیال آیا اور میں نے بے تابی سے پوچھا: "کیا آپ مجھے عرشِ معلّیٰ تک لے جا سکتے ہیں؟"

"اے بندۂ خدا!" اس نورانی شکل نے جواب دیا۔ "عرشِ معلّیٰ تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ انوارِ الٰہی کی تجلّی دیکھنا صرف نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی نسبت اور ہمت سے حاصل ہوئی ہے۔ تجھے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کرنا ہوگا۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا ہوگی"۔

مجھے اس جواب سے بہت مایوسی ہوئی کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ مگر پھر سوچا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حق تعالےٰ کی تجلی دیکھ کر ہوش میں نہیں رہ سکے تو میری کیا حیثیت ہے۔

"آپ اور کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ذاتِ الٰہی کی جانب سے عطا کی گئی برکتیں اور رحمتیں نازل کر سکتا ہوں"۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

یہ سن کر مجھے خیال ہوا اس کے پاس جو کچھ ہے اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ جب حق تعالےٰ اسے نواز سکتا ہے تو مجھے بھی وہ نواز سکتا ہے۔ ساری نعمتیں اور برکتیں مجھے حق تعالےٰ سے وابستہ کر دینی چاہئیں۔ اس خیال کے آتے ہی مجھ پر بے خودی طاری ہونے لگی۔ میں نے اس نورانی شکل کو جانے کا اشارہ کیا اور "حق اللہ" کی ضرب لگانے میں مشغول ہو گیا۔

اس طرح دس سال گزر گئے۔

اور پھر ایک دن مستانی نے مجھے واپس آنے کا حکم دیا۔ میں ویرانوں کو چھوڑتا، پہاڑوں اور دریاؤں کو عبور کرتا ہوا اس کے قدموں میں پہنچ گیا۔

لیکن، جب میں پہنچا تو وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے پلنگ پر پیش گھاس پھوس سے بنی ہوئی چھت کو تک رہی تھی۔

"خان!...... تم، تم آگئے!" وہ نقاہت سے بولی "یہ بہت اچھا ہوا۔"

اپنی محسنہ، اپنی رفیقِ حیات کو ایسی حالت میں دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا: "تم...... تم... تمہاری حالت کیا ہو گئی ہے!"

"خان! تقدیر کے آگے بس نہیں چلتا!" وہ آہستہ سے بولی "مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ اب ہم تم سے جدا ہو جائیں۔"

"نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا!" اور میں نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"صبر کرو خان...... صبر کرو! منشائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دینا ہی بندگی ہے۔" وہ پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "یہ جسم خاکی ہے، خاک میں مل جانا ہی اس کا مقدر ہے تمہیں خوش ہونا چاہیے!" وہ حسبِ عادت مسکرا کر بولی "اب میں حقیقی دنیا میں جا رہی ہوں اس دنیا میں جہاں میرے آقا اپنے غلاموں کو بغیر کسی پردہ کے اپنے دیدار سے سرفراز فرماتے ہیں۔"

"لیکن... پھر میرا کیا ہوگا!" میں نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ جدائی کے تصور سے میرا دل بھر آیا تھا۔

"جہاں میں جا رہی ہوں، وہیں تمہیں بھی آنا ہے!" مستانی نے مجھے سمجھایا "اس جہان تک پہنچنے کی راہیں میں نے تمہیں بتا دی ہیں۔ اگر تم نے اپنے نفس پر قابو رکھا تو جلد ہی منزل پا لوگے۔"

"مستانی! میں نے بے قرار ہو کر کہا "تیرے بغیر اس دنیا میں میرا جی نہیں لگے گا۔"

"یہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے!" اس نے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "خان تم صرف ذاتِ الٰہی سے دل لگائے رہنا۔ میں اس جہان میں تمہارا انتظار کروں گی۔ خبردار!" وہ انگلی اٹھا کر نصیحت کرتے ہوئے بولی "اس کوٹھری کو نہیں چھوڑنا، دکھی لوگوں کی خدمت کرتے رہنا۔ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کی خدمت کرنے والے بندوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

ابھی مستانی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اسے کھانسی کا زبردست دورہ پڑا۔ میں دوڑ کر کونے میں پڑے ہوئے مٹکے کی طرف گیا لیکن وہ تو نہ جانے کب سے خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے مٹی کا پیالہ لیا اور باہر تالاب کی طرف لپکا۔ جب میں پانی کا پیالہ لے کر آیا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ پلنگ خالی تھا، اور ماضی کی طرح مستانی ایک بار پھر میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

لیکن --- اب میں، غیر مرئی سی قوتوں کا مالک تھا۔ میں نے لمحہ بھر کو سوچا کہ مستانی کہاں جا سکتی ہے۔ اور پھر...... پھر میں نے اپنی روح کو جسم سے آزاد کیا۔ اور فضائے بسیط کی جانب محو پرواز ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ عالمِ برزخ کی طرف جا رہی ہے تو میں نہ صرف راستہ میں ملاقات کروں گا بلکہ اسے پانی بھی پلا دوں گا۔

اور جب میں آسمان کے قریب پہنچا تو سبز لباس میں ملبوس دربانوں نے آگے جانے سے روک دیا۔ اس حد کو موت کے بعد ہی پار کیا جا سکتا ہے۔

ناچار میں واپس زمین کی طرف پلٹا اور جب زمین کے قریب پہنچا تو میں نے ایک بڑی سی حویلی کے اندر ایک نہایت ہی انسانیت سوز منظر دیکھا۔

میں نے دیکھا ---

حویلی کے صحن میں ایک دوشیزہ نہایت ہی خوف اور پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگتی پھر رہی ہے۔ اس کے پیچھے دو نہایت خونخوار قسم کے کتے دوڑ رہے ہیں۔ وہ دوشیزہ کے قریب پہنچ کر اسے بھنبھوڑنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ جسم پر خراشیں تھیں۔ اور ان سے خون رس رہا تھا۔ میں ذرا اور قریب آیا تو دیکھا ایک ادھیڑ عمر کا شخص صحن کی آخری دیوار کے ساتھ ایک کرسی پر دا اپنا پاؤں رکھے قہقہے لگا رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس ہے اور دوسرے ہاتھ میں کتوں کی گردنوں سے بندھی ہوئی رسیاں ہیں جنہیں وہ ڈھیلا کرتا تھا تو کتے دوشیزہ سے لپٹ جاتے تھے اور جب دوشیزہ خوف زدہ ہو کر چیختی تھی تو وہ قہقہے لگاتا تھا اور وقتی طور سے کتوں کی رسیاں کھینچ لیتا تھا۔ جب دوشیزہ حواس درست

کرکے بھاگنے کی کوشش کرتی تو پھر یہی عمل دوہراتا تھا۔

میں اب حویلی کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ زمیندار کا بیٹا اصغر تھا۔

درندگی کا یہ کھیل میری برداشت سے باہر تھا۔ اس معصوم لڑکی کی حالت نے میرا دل ہلا دیا۔ میں نے "حق اللہ" کا نعرہ لگایا اور صحن میں اصغر کے سامنے کود پڑا۔

"کون ہو تم ۔ ۔ ؟" وہ اس طرح سے اچھلا جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ شراب کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"اللہ کا بندہ!" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"تمہیں، کوٹ، میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" وہ میری اس اچانک آمد پر غصہ سے بولا۔

(خیال رہے کوٹ، مقامی زبان میں اس اونچی سی دیوار کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے مکانوں کے گرد قلعہ کی فصیل کی طرح بنائی جاتی ہے اور اس چہار دیواری کے اندر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔)

"جانتے ہو، میں کون ہوں!" وہ نہایت ہی غصہ کی حالت میں بولا۔

"تم، فقط مٹی کا ڈھیر ہو!" میں نے اطمینان سے جواب دیا "تم اپنے شیطانی کھیل کی سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف پھونک ماری۔ وہ چیخ کر زمین پر گرا اور لوٹنے لگا۔ اس کے شکاری کتے دم دبا کر حویلی کے اندر بھاگ گئے۔ میں نے دوشیزہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ چھپائے حویلی کے بڑے دروازے کی جانب دوڑ رہی تھی۔ میں نے "حق اللہ" کہہ کر انگلی کا اشارہ کیا۔ بڑا سا آہنی دروازہ کھل گیا اور دوشیزہ بھاگتی ہوئی اس دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں نے اصغر کی طرف دیکھا۔ وہ زمین پر آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا۔

اب میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا فوراً ہی واپس اپنی کوٹھری میں آگیا۔

اس واقعہ سے میرا سر نہ جانے کیوں بھاری سا ہو گیا۔

میں اکیلا رہ گیا

مستانی کی وصیت کے مطابق میں نے اس کوٹھڑی کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اب وظیفوں اور چلّوں کی خاطر میں دور نہیں جاتا تھا۔ مستانی کے بعد مجھ سے کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ اس کی موت کا مجھے سخت افسوس ہوا تھا کیونکہ میں ابھی منزل سے دور ہی تھا کہ اس نے اچانک میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن اس کے آخری الفاظ نے میری ڈھارس بندھا دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب تک مستانی نے جو کچھ مجھے بتایا ہے وہی سب کچھ ہے اور اگر میں اس پر عمل کرتا رہوں گا تو ایک نہ ایک دن اپنی منزل ضرور پالوں گا۔

میں عبادت و ریاضت میں پھر سے مشغول ہو گیا۔

میرے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ ایک دن، جب کہ میں عصر کی نماز سے فارغ ہوا تو خیر النساء کو اپنی چوکھٹ پر کھڑے دیکھا۔ خیر النساء وہی تھی جس کے گھر کافی عرصہ پہلے مجھے مستانی عید میلاد النبی کی محفل میں لے کر گئی تھی۔ خیر النساء کے چہرے پر زمانے کی گرد جمی ہوئی تھی۔ لیکن میں نے اسے پہچاننے میں دیر نہیں کی۔ البتہ وہ مجھے نہیں پہچان سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میرا حلیہ بگڑا ہوا تھا نہ بھی ہوتا جب بھی وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نے مجھے مستانی کے ساتھ عورت کے روپ میں دیکھا تھا۔

مستانی کا یہ آستانہ نہ صرف حیدرآباد شہر کے باہر واقع تھا بلکہ کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔

خیر النساء کی اس غیر متوقع آمد نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال، خیر النساء یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے یہاں آنے کا مقصد پوچھا تو خیر النساء نے بتایا کہ اس کی بیٹی مہر النساء کی شادی کو ایک طویل عرصہ بیت چکا ہے لیکن ابھی تک اس کے اولاد نہیں ہوئی اور اب اس کا مستقبل خطرہ میں پڑ گیا ہے کیونکہ اولاد نہ ہونے کے جرم میں اس کے سسرال والے طلاق دینے کی سوچ رہے ہیں۔

خیر النساء بیٹی کی طرف سے سخت پریشان تھی۔ اس کا جہاں تک بس چلا، وہ نامی گرامی پیروں اور گدی نشینوں کے پاس گئی لیکن کسی در سے اس کی مراد پوری نہیں ہوئی۔

پھر ایک دن جب وہ ایک بزرگ کے مزار سے اپنی بیٹی کے لیے منت مان کر لوٹ رہی تھی تو اس کی ملاقات۔ آلونے سے ہو گئی تھی۔ عرصہ دراز کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اور جب خیر النساء نے اُسے اپنی بیٹی کا دکھڑا سنایا تو اس نے بتایا کہ حیدرآباد میں جیکب تالاب کے کنارے ایک فقیر رہتا ہے، وہ اس کے پاس چلی جائے۔ اور اس طرح خیر النساء مجھ تک پہنچ گئی۔

اس داستان کو پڑھنے والوں کو علم ہوگا کہ خیر النساء کی بیٹی مہر النساء کی استاد ،، مستانی " تھی۔

میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ مستانی جس طرح غائب ہوئی تھی اور جس حالت میں اس نے جس طرح کی باتیں مجھ سے کی تھیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مر چکی ہے، اور اس کے وصال کو بھی ایک عرصہ گزر چکا تھا

لیکن خیر النساء کی اس بات نے کہ اُسے میرا ٹھکانہ مستانی نے بتایا ہے، مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ.... کیا مستانی زندہ ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو مجھے اس سے ملنا چاہیے لیکن پھر سے پھر میرے ذہن میں فوراً ہی دوسرا خیال آیا کہ اب وہ مجھ سے نہیں مل سکے گی۔ اگر اُسے میرے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو وہ مجھ سے جدا ہی کیوں ہوتی۔

مستانی کا یہ رُخ میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔ لیکن میں نے اس کے خیال کو دماغ سے جھٹک دیا۔ اور "اللہ ہو" کا نعرہ لگا کر مراقبہ کی واردات و کیفیات میں ڈوب گیا۔

مراقبہ کے بعد معلوم ہوا کہ خیرالنساء کی بیٹی مہرالنساء پر سخت قسم کا جادو کیا گیا ہے میں نے خیرالنساء سے پوچھا "تم اپنی بیٹی کو یہاں لا سکتی ہو؟"

"سائیں بابا!" خیرالنساء نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اسے یہاں لانا مشکل ہے، کیوں کہ اس پر دورے پڑتے ہیں پھر سسرال والے بھی کسی قسم کی مدد کرنے کو تیار نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "پھر مجھے ہی چلنا ہوگا۔"

"آپ... آپ... چلیں گے؟" وہ خوشی سے بولی کیوں کہ مستانی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ فقیر آستانہ چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا۔

"چلو!" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اور کوٹھری سے باہر آگیا۔

میرا خیال تھا کہ میں صبح تک واپس لوٹ آؤں گا۔ اس وقت مستانی کی وصیت میرے ذہن میں نہیں تھی۔

میں ایک بار پھر شہر کی طرف جا رہا تھا۔

خیرالنساء نے مجھے اپنی بیٹی کے سسرال کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا اور خود اندر چلی گئی۔

اُسے کیا معلوم یہ گھر میرا اپنا گھر تھا۔ یہ میرے خالو کا گھر تھا اور شاہد میرا بھائی خیرالنساء کا داماد تھا۔ جس وقت مجھے اندر بلایا گیا تو گھر کے افراد رات کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے میں صحن میں آیا تو شاہد مجھے دیکھ کر چونکا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ کیوں کہ اس سے قبل بازار میں میری اس سے ایک بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اور اس نے مجھے گھر چلنے کی دعوت دی تھی۔ شاہد نے نہایت عقیدت و احترام سے میرے لیے تخت پر چادر بچھائی اور بولا۔ "سائیں بابا! بیٹھیے۔"

میں تخت پر بیٹھ گیا۔

تخت پر بیٹھنے کے بعد میں نے سرسری جائزہ لیا۔ اب یہ مکان دو منزلہ بن چکا تھا۔

میرے سامنے پلنگ پر خالہ اور خالو بیٹھے تھے۔ وہ دونوں عمر کا طویل سفر طے کر چکے تھے۔ اور اب ان کی خواہش یہ تھی کہ مرنے سے پہلے شاہد کی اولاد کو دیکھ لیں۔ شاہد کی بھی یہی خواہش تھی۔ اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہ ابھی تک بڑھاپے کے سہارے سے خالی تھا۔

میری جانب ہر شخص پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان سب سے اپنا تعارف کرا دوں۔ ان سب کو بتا دوں کہ میں تو تمہارا ہی ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس سے کیا فائدہ؟ تیری دنیا تو ان سب سے الگ ہے، تیرا ٹھکانہ تو ویرانہ ہے، تیرے لیے تو اپنے بھی بیگانے ہیں۔ مجھے تو واپس لوٹ کر جیکب آباد جانا ہے۔

میں نے زائد خیالات کو دماغ سے جھٹک دیا۔ اور شاہد سے کہا۔ "تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

میری آواز سن کر خالہ اور خالو یکبارگی اس طرح چونکے جیسے یہ آواز ان کی جانی پہچانی ہو۔ چند لمحوں بعد مہرالنساء میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے نظر بھر کر دیکھا۔ جادو اس کے جسم میں سرایت کر چکا تھا۔ میں نے "سبحان اللہ" کا نعرہ لگایا اور وہ ٹوٹی ہوئی پتنگ کی طرح زمین پر گر گئی۔

میں نے شاہد سے پوچھا۔ "تجھے اولاد کی تمنا ہے؟"

شاہد نے ماں باپ اور ساس کی موجودگی میں شرم سے گردن جھکا لی۔

"سائیں بابا! اولاد کی تمنا کسے نہیں ہوتی۔" خالہ جان نے نہایت ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "ہم کو شاید خدا نے اب تک زندہ ہی اس لیے رکھا ہے کہ پوتے پوتیوں کو دیکھ لیں۔"

"اگر آپ کی دعا سے میری بیٹی کی گود بھر گئی تو منہ مانگا انعام دوں گی۔" مہرالنساء کی ماں خیرالنساء نے کہا۔

"ہاں، ہاں!" خالہ جان نے چڑ کر کہا۔ "اس کا بانجھ پن دور ہو گیا تو جو کہو گے، انعام ملے گا۔"

خالہ جان کے اس تمسخر آمیز جملے سے چڑ کر میں بھی بولا "مجھے انعام نہیں چاہیے ، خالہ جان! خدا آپ کی خواہش پوری کر دے گا۔"

میری یہ بات سنتے ہی خالہ، خالو اور شاہد جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ میں نے بے خیالی میں خالہ جان کو براہِ راست مخاطب کیا تھا، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا! زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی واپس نہیں آتے۔ اب خود کو چھپانا بے کار تھا۔ لہٰذا میں نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی کہانی ان لوگوں کو سنا دی۔

میں نے مہر النساء پر کیے گئے جادو کو دو راتوں ہی میں کاٹ دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں واپس اپنی کوٹھری میں جانا چاہتا تھا لیکن اپنوں کی محبت نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ دراصل خالہ اور خالو چاہتے تھے کہ میں کم از کم اس وقت تک تو ساتھ رہوں جب تک ان کی گود میں پوتا یا پوتی آ جاتے۔ خدا جانے یہ ان کی محبت تھی یا وہ میرے دعوے کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔

مجھے اوپر والی منزل پر ایک کمرہ دے دیا گیا۔ اس میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ میرے برابر والے کمرے میں مہر النساء کی ماں خیر النساء رہتی تھی۔ میرے برابر والے کمرے میں مہر النساء کی ماں خیر النساء رہتی تھی۔ بیٹی کی شادی کے بعد اس نے میرپور خاص چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ اب حیدرآباد میں اپنے داماد کے پاس ہی رہائش اختیار کر چکی تھی۔ اس دنیا میں بیٹی کے سوا اور کوئی اس کا تھا بھی تو نہیں، وہ نیک بخت ہر وقت میرا خیال رکھتی تھی۔ شاید اُسے اپنی بیٹی کے مستقبل کی بہت زیادہ فکر تھی۔ اور وہ اسی ہی وجہ سے نوکر کی طرح آگے پیچھے رہتی تھی۔ تاکہ میں زیادہ سے زیادہ اس کی بیٹی کے لئے دعا کرتا رہوں۔ میں اس کی خدمت گزاری سے متاثر تھا۔

رانی کو بھی میرا حال معلوم ہو چکا تھا۔

اس کے سسرال والے بھی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس سے سخت نالاں تھے اور انہوں نے اُسے واپس میکے بھیج دیا تھا۔ رانی کا شوہر پڑھا لکھا تھا۔ اُسے رانی سے محبت تھی لیکن اولاد نہ ہونے کا داغ ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ ماں باپ کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ انہیں بتائے بغیر اپنی بیوی سے ملنے سسرال چلا آتا تھا۔

میں نے رانی کا بھی علاج کیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ نند بھاوج دونوں کا پاؤں بھاری ہو گیا۔

دوسرے تیسرے مہینے ہی حمل کے واضح آثار ظاہر ہونے لگے۔ پورا خاندان مجھے آنکھوں پر بٹھانے لگا۔

اب رانی کے سسرال والے بھی آنے لگے اور جوں جوں دن قریب آتے جا رہے تھے، میرے تذکرے زیادہ سے زیادہ ہوتے جا رہے تھے اور یوں میری شہرت پھیلتی جا رہی تھی۔

بے اولاد خواتین کا میرے پاس جمگھٹا لگنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ میرے لیے عمدہ کھانے پینے کی چیزیں لاتیں۔ شروع میں تو میں نے ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ میں نے انہیں سختی سے منع بھی کیا۔ لیکن یہ اندھا اعتقاد بھی کیا خوب چیز ہے، میرے انکار کو وہ اپنے لیے مطلب براری کی نوید سمجھتی تھیں۔

دنیا میں رہ کر اس کی لذتوں سے انکار کرنا، انسان کے بس کی بات نہیں۔ میں بھی کب تک انکار کر سکتا تھا۔ باجرہ کی روٹی کھانے والا کب تک حلوہ سے منہ موڑ سکتا تھا۔

آج اس بات کو سوچتا ہوں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اللہ کو محبوب رکھنے والوں کے دل میں اسی لیے دنیا کی محبت نہیں ہوتی۔ میں نے اس نعمتوں سے بھری ہوئی پُرکشش دنیا میں اگر غلطی کی تھی یا نہیں اس کا اندازہ آپ کو میری اس داستان کے ختم ہونے پر ہو جائے گا۔

رانی کے گھر والے اُسے آنکھوں پر بٹھا کر لے گئے، ان کا کہنا تھا کہ بچے کی ولادت شوہر کے

گھر میں ہونا چاہیے۔ میں نے بھی ان کے اس موقف کی حمایت کی، کیونکہ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ خوشی اس کے اپنے ہی گھر پر ہو۔ اور پھر.... پھر شاہد بھی باپ بن گیا۔

ہر شخص خوش تھا۔ اس خوشی میں تمام برادری اور محلہ میں لڈو تقسیم کیے گئے۔ رات گئے تک ہیجڑوں کی ٹولیاں گانا بجانا کرتی رہیں۔ اور یہ جشن، ایک دو دن نہیں، پورے سات دن تک منایا جاتا رہا۔ اور میں بھی لطف اندوز ہوتا رہا۔

ایک رات، جب کہ تمام لوگ جشن ختم ہونے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے، میں اپنے کمرے میں مسہری پر بیٹھا دل ہی دل میں "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کا ورد کر رہا تھا کہ اچانک "غوں، غوں" کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز فضا سے کھڑکی کے راستے آ رہی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے گردن اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا، ایک کچی ہانڈی فضا میں تیرتی ہوئی اسی گھر کی طرف آ رہی تھی۔

میں تیزی سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس آ کر انگلی پر پھونک مار کر ہانڈی کی طرف اشارہ کیا۔ ہانڈی فضا میں معلق ہو گئی اور اس کے اندر سے آنے والی "غوں، غوں" کی آواز "غوں غوں" میں بدل گئی۔ میں نے ایک وظیفہ پڑھا اور ہانڈی کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ ہانڈی نے اپنا رُخ بدلا اور جدھر سے آئی تھی، اس طرف چلی گئی۔

میری نگاہیں ہانڈی کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔

ہانڈی اُڑتی ہوئی حیدرآباد شہر کے باہر سرسبز و شاداب کھیتوں پر سے ہوتی ہوئی ایک کوٹ کے اندر پہنچ گئی۔ میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ میں اس حویلی میں پہلے بھی آ چکا تھا، یہ اصغر کی حویلی تھی۔

ہانڈی کو واپس فضا میں آتے دیکھ کر اصغر بدحواس ہو کر اندر بھاگا۔ اور دوسرے ہی لمحے سکھ دیو باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ اور دوسرے ہاتھ کی چھنگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ ہانڈی کے قریب آتے ہی اس نے اپنی چھنگلی کے خون کے چھینٹے اس پر پھینکے

ہانڈی سے ایک شیطانی قہقہہ بلند ہوا اور وہ اس کے قدموں میں اُتر گئی۔

سکھ دیو نے ہانڈی کو اٹھایا اور حویلی کے اندر چلا گیا۔ میرے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے اپنی بصیرت کو سمیٹا اور واپس کھڑکی کو تکنے لگا۔

سکھ دیو ... میرے ذہن پر ایک بار پھر یہ شخص چھا گیا۔ مجھے پہلی بار خطرہ کا احساس ہوا۔ اس نے یہ ہانڈی کیوں بھیجی تھی، میں نے سوچا۔

اور پھر ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔

اصغر اس گھرانے سے رانی کے ساتھ شادی نہ ہونے کا انتقام لے رہا تھا۔ اور اس سلسلہ میں سکھ دیو شروع ہی سے اس کا معاون و مددگار بنا ہوا تھا۔ اصغر اس کے کہنے پر اس نے نہ صرف رانی بلکہ اس کی بھاوج کی بھی کوکھ باندھ دی تھی۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ ان دونوں کی گود بھر چکی ہے تو اس نے انتقاماً یہ ہانڈی بھیج دی۔ اس کا مقصد کسی کی جان لینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن وہ کس کی جان لینا چاہتا تھا۔ شاہد کے بچے کی یا اس کے جادو کا توڑ کرنے والے کی!

مجھے ایک بڑے خطرے کا احساس ہوا۔ میں فوراً ہی مسہری سے اٹھا اور اپنی اور تمام افرادِ خانہ کی حفاظت کا فیصلہ کر لیا۔ روحانیت کا تھوڑا سا بھی سوجھ بوجھ رکھنے والے اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ کسی گھر کے اطراف میں پڑھی ہوئی کیلیں گاڑ دینے سے وہ گھر حصار میں آ جاتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے یہ دیکھنے کی خاطر کہ اب سکھ دیو کے ارادے کیا ہیں، اپنی نگاہ کو وسیع کر دیا۔

میری باطنی نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ میری نظریں تمام مادی رکاوٹوں کو پار کرتی ہوئی حویلی کے اس کمرے میں پہنچ گئیں جہاں سکھ دیو اور اصغر پریشان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ ..... یہ ہانڈی واپس کیسے آ گئی مہاراج؟" اصغر نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہی وچار تو مجھے بھی ہے" سکھ دیو نے جواب دیا، پھر کمرہ میں ٹہلتے ہوئے بولا "اس دھرتی پر ایسا شکتی وان کون ہے جو میرے منتر کا توڑ کر سکے!"

"یہ وقت سوچنے کا نہیں، کچھ کرنے کا ہے مہاراج" اصغر نے اسی طرح خوف زدہ لہجہ میں کہا۔

"وچار بنا کچھ نہیں کیا جا سکتا" سکھ دیو نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا "جب تک مقابل کا پتہ نہ چل جائے، کچھ نہیں کیا جا سکتا، کچھ نہیں کیا جا سکتا"

"میرا تو خیال ہے وہ جو کوئی بھی ہے، اسی گھر میں رہتا ہے" اصغر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں! تیرا وچار صحیح ہے" سکھ دیو نے اس کے خیال کی تائید کی۔ پھر فضا میں نظریں گاڑتے ہوئے بولا "لیکن ــ وہ کون ہو سکتا ہے!"

"وہ جو کوئی بھی ہے، اس نے آپ کے جادو کا توڑ کر کے میری محبوبہ کی گود بھر دی ہے" اصغر بے بسی سے بولا۔

سکھ دیو نے اصغر کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گردن جھکائے بے چینی کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ اُسے خاموش دیکھ کر اصغر کو مزید بولنے کا حوصلہ ہوا۔ وہ نہایت ہی بے چارگی سے بولا "مہاراج! آپ کے ہوتے ہوئے میرا دشمن سکون سے رہ رہا ہے"

یہ سن کر سکھ دیو ایک دم رُک گیا۔ پھر وہ مسکرا کر بولا "آج سے وہ تمہارا ہی نہیں میرا بھی دشمن ہے اور میں اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتا... کبھی نہیں"

سکھ دیو کی بات سن کر اصغر کا حوصلہ بڑھا اور وہ بے تابی سے بولا "تو پھر کچھ کیجئے نہ"

"جلد بازی اچھی نہیں" اس نے اصغر کو سمجھایا "پہلے مجھے دشمن کے بارے میں

جان لینے دو کہ وہ کتنی شکتی کا مالک ہے۔

"مہاراج!" اصغر کھسیانا ہو کر بولا "وہ آپ کے منتر کا بار بار توڑ کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ اس کی طاقت کا اندازہ لگانے کی سوچ رہے ہیں"

"اس کی اس ہی حرکت نے تو مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے" اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اصغر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا "تم نہیں جانتے جب دو پہلوان مقابلہ پر آتے ہیں تو جیت اس ہی کی ہوتی ہے جو سوچ سمجھ کر داؤں لگاتا ہے" پھر وہ فضا میں دوبارہ دیکھتے ہوئے بولا "تم چنتا نہ کرو۔ میں اپنے سے ٹکرانے والے کو سکھ کی نیند نہیں سونے دوں گا۔ نہیں سونے دوں گا"

یہ کہہ کر اس نے دبا ہوا سا قہقہہ لگایا۔ میں نے اس کی فضول باتیں سننے کے بجائے واپس آنا ہی بہتر سمجھا۔

اس واقعہ کے کوئی ایک ماہ بعد ہی جب کہ رانی اپنے میکے آئی ہوئی تھی، صبح ہی صبح اس کا بچہ پلنگ پر سے غائب ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سکھ دیو کی شرارت ہے۔

میں نے مراقبہ کے ذریعے معلوم کرنا چاہا کہ بچہ کہاں ہے لیکن صحیح طور سے کچھ معلوم نہ ہو سکا

امتحان

اس مرتبہ سکھ دیو جو حرکتیں کر رہا تھا وہ ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس کا ہر وار میرے خلاف کارگر ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی ان حرکتوں نے میرے "روحانی بھرم" کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے اپنی بزرگی کا مینارہ زمین بوس ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

سکھ دیو نے میری انا کو چیلنج کیا تھا۔ اس نے میرے روحانی وقار کو للکارا تھا۔ اگر میں رانی اور اس کے بچے کو واپس نہیں لا سکا تو۔۔۔ تو۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

میرے عقیدت مند مجھے کیا سمجھیں گے؟

نہیں، نہیں۔ میں بہت کچھ ہوں۔ مستانی نے مجھے بہت کچھ عطا کیا ہے، بہت کچھ سمجھایا ہے، بہت کچھ سکھایا ہے۔ غرور سے میرا سر خود بخود بلند ہو گیا۔ سکھ دیو میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔

خیالات کی اس کشمکش کو جھٹک کر میں ایک عزم کے ساتھ اٹھا۔ وضو کیا اور پھر مصلّٰی پر بیٹھ کر ایک وظیفہ پڑھنے لگا۔

اس وظیفہ کی یہ خاصیت تھی کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ میری ظاہری اور باطنی دونوں نگاہیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی تھیں۔ مستانی نے یہ وظیفہ مجھے خاص طور سے بتایا تھا۔

وظیفہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی نگاہیں کمرے کی کھڑکی کے باہر دوڑائیں۔

میری نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی اور پھر ایک جگہ جا کر رک گئی۔

میری آنکھوں کے سامنے گہری دھند سی چھا گئی۔ یہ دھند کیسی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میری نگاہیں اس دھند سے نہیں گزر پا رہی تھیں۔ میں نے بہت کوشش کی، بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔

ابھی میں اس بارے میں کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری بصیرت خود بخود سمٹنے لگی جیسے کہ تھک گئی ہو۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور پھر۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد میں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو مسل رہا تھا۔ میرے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔

اس ناکامی سے میں جھنجھلا سا گیا۔ میں نے اپنی روح کو جسم سے جدا کر کے سکھ دیو کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہاں پہنچ کر میں رانی اور اس کے بچے کو کس طرح واپس لاؤں گا، یہ ارادہ ترک کر دیا اور۔۔۔ اور آیتِ کریمہ کا ورد کرنے لگا۔

مستانی کا کہنا تھا کہ آیتِ کریمہ کا وظیفہ اس ہی وقت پڑھا جائے جب ہر طرف سے ناکامی ہو کیوں کہ اس وظیفہ کے تابع جو موکل ہے وہ نہایت ہی عبادت گزار اور اقدس والا ہے۔ اس کو بلانے کا مطلب اس کی عبادت میں خلل ڈالنا ہے۔ جس کا نتیجہ عامل کے اعمال میں لکھا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب میں نے یہ وظیفہ پڑھا تھا اور پہلی بار موکل حاضر ہوا تھا تو میں نے کوئی کام لیے بغیر اس کو واپس کر دیا تھا لیکن، اب میں ایک مشکل میں آن پھنسا تھا۔ میں نے تمام باتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ میں ہر طریقہ سے رانی اور اس کے بچے کی بازیابی چاہتا تھا۔ میں سکھ دیو کی برتری ختم کر دینا چاہتا تھا۔ یہ میری انا کا سوال تھا۔ میرے بھرم کا مسئلہ تھا۔

اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا کہ میں اس وظیفہ سے مدد حاصل کروں۔

میں نے وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ اور چند ۔ ۔ ۔ ٹ بعد ہی میرے سامنے ، زمین پر

روشنی کی دھار پڑنا شروع ہو گئی اور پھر . . . . پھر نورانی شکل نے ظاہر ہو کر سلام کیا۔

میں نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی کہا: "اے مقدس بزرگ! میں نے ایک کام کی خاطر آپ کو تکلیف دی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ رانی اور اس کا شیر خوار بچہ کہاں ہیں۔؟"

نورانی شکل نے میری بات سنتے ہی جواب دیا: "اے بندۂ خدا! وہ سکھ دیو کے قبضے میں ہیں۔"

"کیا آپ انہیں لا سکتے ہیں؟" اتنی جلد جواب دینے پر میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اے بندۂ خدا! ایسا ہونا ناممکن ہے۔" نورانی شکل نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے کسی قدر غصّہ سے پوچھا۔

"اے بندۂ خدا! شاید تجھے علم نہیں کہ سکھ دیو شیطانی طاقتوں کا مالک ہے۔" نورانی شکل نے جواب دیا۔ "اور ہمیں شیطان سے دور رہنے کا حکم ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ سکھ دیو شیطانی طاقتوں کا مالک ہے؟" میں نے اسی طرح تیز و طرار لہجے میں کہا۔ "اور وہ مخلوق خدا کو آزار پہنچانے میں مصروف رہتا ہے۔"

"مجھے صرف اس بات کا علم ہوتا ہے، جو کہ مشاہدے میں آتی ہے۔" نورانی شکل نے جواب دیا۔ "سکھ دیو بھی بندۂ خدا ہے لیکن اس وقت شیطانی قوتیں اس کے ساتھ ہیں۔"

"اے محترم ہستی!" میں نے اُسے احترام سے مخاطب کیا۔ "تم اس وقت کوئی ایسی تدبیر کرو کہ اس کی شیطانی قوتیں بے کار ہو جائیں۔ تم پاک ہو، تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"اے بندۂ خدا! نجس چیز سے چھو کر پاک شئے بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔" نورانی شکل نے مختصراً جواب دیا۔

"ہونہہ! تو تم اس وقت بے بس ہو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اس آیت کی جو برکتیں تم سے منسوب ہیں کیا وہ . . . . ؟"

"اے بندۂ خدا! حق تعالٰے اپنے نیک بندوں پر رحمتیں نازل فرماتا ہے۔" نورانی شکل نے جواب دیا۔ "اور مجھے حکم الٰہی کے مطابق اس کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن میں اس اختیار کو غلط استعمال نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس وقت سکھ دیو کے پاس شیطانی قوتیں موجود ہیں، اور میں اس پر رحمت نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر تم رانی اور اس کے بچے پر اپنی رحمتیں نازل کر دو۔" میں نے سوچ کر کہا۔

"اس وقت وہ بھی شیطانی قوتوں کے گھیرے میں ہیں۔ ان تک پہنچنے کی خاطر تمہیں میرے زبردست موکلوں سے کام لینا ہوگا۔" نورانی شکل نے بتایا۔

اس انکشاف سے میں چونک اٹھا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اس کے تابع اور بھی موکل ہیں۔ میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے دریافت کیا۔ "وہ کیا کر سکتے ہیں؟"

"وہ حکم الٰہی سے اپنے فعل کے مختارِ کل ہیں۔" نورانی شکل نے بتایا۔ "وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ وہ خیر و شر کا مجموعہ ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اے بندۂ خدا! تم ان سے جو چاہو کام لے سکتے ہو۔" نورانی شکل نے وضاحت کی۔ "وہ اپنی فطرت میں گم ہیں۔ انہیں نفع اور نقصان پہنچانے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ ان کے فعل کی تمام ذمہ داری ان سے کام لینے والے پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس طرح وہ معصوم ہیں۔"

"ٹھیک ہے، کیا تم انہیں پیش کر سکتے ہو؟" میں نے نورانی شکل کے بتائے ہوئے اشارات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت میرے ذہن پر صرف رانی اور اس کے بچے کو واپس لانے کا جنون سوار تھا۔ خیر و شر سب کچھ میرے دماغ سے نکل چکا تھا۔

"کیوں نہیں!" نورانی شکل نے میرے پوچھنے پر جواب دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی یک لخت روشنی ختم ہو گئی اور میں اس ہی جگہ سبز لباس میں ملبوس نہایت ہی چھوٹے قد کے دو ماروائی انسان نمودار ہوئے۔ دونوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ پھر دونوں ایک ساتھ بولے "کیا حکم ہے؟"

میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

دونوں ایک ساتھ بولے "ہم دونوں خیر و شر ہیں"

میں نے دیکھا کہ دونوں ایک ساتھ بولتے ہیں جس سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میں نے پوچھا "تم دونوں ایک ساتھ کیوں بولتے ہو؟"

"یہ ہماری فطرت ہے۔ ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں" دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"لیکن اگر چاہو تو مناسب ہے کہ ایک بولے" میں نے مشورہ دیا۔

"ہم منشائے الٰہی کے تابع ہیں۔ اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔ لوگ خیر و شر کو بہ آسانی پہچان لیں گے۔ لہٰذا ذاتِ الٰہی نے جو فطرت بنائی ہے اس ہی پر قائم رہنے پر مجبور ہیں" دونوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

"سکہ دیو کو جانتے ہو؟" میں نے مقصد کی بات کی۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں!" دونوں نے ایک ساتھ مسکرا کر جواب دیا۔

"اس کے قبضے میں رانی اور بچے ہیں" میں نے بتایا۔ "کیا تم انہیں واپس لا سکتے ہو؟"

"ہاں، لا سکتے ہیں" دونوں نے ایک ساتھ گردن ہلا کر کہا "لیکن اس کے لیے تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم جو چاہو گے ہم وہی کریں گے"

ان کی یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے فوراً ہی سکہ دیو کے پاس پہنچ کر اُسے مزہ چکھانے کا فیصلہ کیا اور بے تابی سے بولا "مجھے سکہ دیو کے پاس پہنچا دو"

میری یہ بات سنتے ہی دونوں، ایک میری دائیں جانب اور ایک بائیں جانب آکھڑے ہوئے۔

میں زندگی میں پہلی بار اپنے خاکی جسم کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ مجھے حیدرآباد شہر کی روشنیاں عجیب سی لگ رہی تھیں۔

سکھ دیو سے مقابلہ

جب میں حویلی کے ایک سجے سجائے کمرے میں داخل ہوا تو سکھ دیو ایک صوفہ پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس کے قریب ہی رانی کا شیر خوار بچہ سو رہا تھا۔ سامنے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر رانی اپنا پورا پورا بچاؤ کر رہی تھی۔ نورانی شکل کی مجبوری میری سمجھ میں آ گئی۔ اس کمرے میں اصغر کے اوپر سکھ دیو کا شیطان سوار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نورانی شکل نے رحمتیں نازل کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔

دونوں بو نے میرا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ یہ منظر میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ چھڑا لیے۔ ہاتھ چھوڑتے ہی میں نظر آ گیا۔ سکھ دیو مجھے دیکھتے ہی صوفہ سے اس طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اصغر بھی رانی کو چھوڑ کر دم بخود رہ گیا۔ رانی بھاگ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی۔

"سکھ دیو۔ ذلیل، کمینے۔۔۔!" میں غصہ سے چلایا۔

"کون ہے تو؟" سکھ دیو نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں کون ہوں، یہ تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے غصہ سے بے قابو ہو کر کہا۔ اور پھر اصغر کی طرف پلٹ کر کہا۔ "خبیث! تو اپنی سزا کے لیے تیار ہو جا!"

اصغر فوراً ہی سکھ دیو کے قدموں سے لپٹ کر بولا۔ "مہاراج۔ کچھ کیجئے!"

لیکن اس سے پہلے کہ سکھ دیو کچھ کرتا میں نے "حق اللہ" کا نعرہ لگا کر انگلی کا اشارہ

کیا اور اس کے ساتھ ہی اصغر نے ایک چیخ مار کر کہا۔ "مہاراج! مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے، ہائے میں مر گیا!" وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

"مورکھ! تو کون ہے؟" سکھ دیو نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"سکھ دیو! — میں مستانی کا غلام ہوں۔" میں نے بڑے ہی پُرعزم لہجے کہا۔ "اور اب۔۔۔!"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" سکھ دیو میری بات کاٹ کر اطمینان سے بولا۔ "میں کئی دنوں سے وچار میں تھا کہ میرے منتر کا توڑ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ اچھا ہوا آج تم خود ہی آ گئے!"

"ہاں، اور آج میں تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دینے آیا ہوں!" میں نے اسی طرح غصے کے انداز میں کہا۔

"تم مجھے سزا دو گے؟" اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

مجھے تعجب اس بات کا تھا کہ سکھ دیو کو میری کسی بھی حرکت پر، کسی بھی بات پر غصہ نہیں آیا بلکہ وہ دریا کی طرح پرسکون تھا جب کہ میں غصے میں سمندر کی مانند بپھر رہا تھا۔

"سناؤ، تمہارے پیر و مرشد کا کیا حال ہے؟" اس نے مجھ سے اس طرح پوچھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"او کمینے! تو اپنی ناپاک زبان سے میرے پیر و مرشد کا نام نہ لے!" میں غصہ سے چلایا۔

"اوہ! بڑا گھمنڈ ہے اپنے پیر و مرشد پر!" اس نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اصغر بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑا پلکیں جھپکا رہا ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ سکھ دیو نے باتوں ہی باتوں میں میرے وار کا توڑ کر لیا تھا۔

اصغر کو ٹھیک حالت میں دیکھ کر میں ایک بار پھر آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے

"حق اللہ" کہہ کر ایک بار پھر انگلی اٹھائی لیکن میری انگلی فضا میں اٹھی کی اٹھی رہ گئی۔ جیسے کسی نے پکڑ لی ہو۔ میں نے انگلی نیچے لانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ سکو دیو کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں نے دونوں بونوں کی طرف دیکھا۔ میرا اشارہ کرتے ہی دونوں نے فضا میں اس طرح ہاتھ چلائے جیسے کسی کو پکڑ رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور میرا ہاتھ نیچے آگیا۔ ہاتھ کے نیچے آتے ہی سکو دیو کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کر بولا "مورکھ! جس کی خاطر تو یہاں آیا ہے دیکھ وہ کیا کر رہی ہے.....!"

"او خبیث! تو اوچھی حرکتوں پر اتر آیا ہے" میں دھاڑا اور ایک آیت پڑھ کر اس کی طرف پھونکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس وظیفے سے جل کر بھسم ہو جائے گا۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر اطمینان سے کھڑا رہا۔ میں نے اپنی اس ناکامی پر بے بسی سے بونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ بولے "تمہارا کلام پاک ہے اور یہ بندہ ناپاک ہے۔ ہمیں حکم دو۔"

میں نے کہا "پہلے رانی کو ہوش میں لاؤ۔"

"یہ تو نظر بندی کا کمال ہے" ان دونوں نے جواب دیا "وہ دیکھو تمہاری بہن تو وہ بیٹھی ہے!"

میں نے صوفے کی طرف دیکھا۔ رانی شرم و حیا کا پیکر بنی اپنے بچے کو سینے سے لگائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ رانی کو صحیح حالت میں دیکھ کر سکو دیو طنزیہ مسکراہٹ سے بولا "معلوم ہوتا ہے اس چھوکری نے تمہیں کچھ سکھا دیا ہے۔ لیکن یاد رکھ مورکھ! اس دھرتی پر دو شکتی وان نہیں رہ سکتے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے نہایت پھرتی سے آگے بڑھ کر شراب کا گلاس اٹھایا۔ اس پر پھونک ماری اور شراب میری طرف اچھال دی۔

شراب کے قطروں نے ننھے ننھے بچھوؤں کی شکل اختیار کر لی۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے بونوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر

انہیں اس طرح سمیٹا جس طرح جھاڑو سے کوڑا سمیٹا جاتا ہے۔

اپنے منتر کا یہ حشر دیکھ کر اس نے پریشانی سے کمرے میں چاروں جانب نظر دوڑائی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ دونوں بونے پردۂ غیب میں تھے، وہ اسے نظر نہیں آئے۔ بونے صرف مجھے ہی نظر آ رہے تھے۔

پھر وہ نہایت ہی ڈھٹائی سے بولا "مورکھ! تو نرک میں جانے کو تیار ہو جا۔"

اب میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا میں نے بونوں سے کہا "اس بدبخت کو جہنم رسید کرو۔"

ابھی الفاظ میری زبان سے پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ سکو دیو کے اطراف میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ آگ کے اس دائرے میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی زبان تیزی سے کسی منتر کا جاپ کر رہی تھی اس نے آگ سے دوبارہ نکلنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہا۔

پھر آگ کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔ سکو دیو کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ جوں جوں دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا، وہ سخت خوف زدہ اور پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ اور میرے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر سے پھر میں نے دیکھا کہ سکو دیو زمین میں دھنسنا شروع ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی جملہ نکل رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ آخری وقت میں مسلمان ہو رہا ہے لہٰذا حقارت سے بولا "سکو دیو! تو خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ تیرا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

سکو دیو نے گردن تک دھنسنے کے بعد نہایت ہی بے بسی سے کہا "مورکھ! ہم پھر ملیں گے۔ میری بات یاد رکھنا اس دھرتی پر دو شکتی وان نہیں رہ سکتے۔"

آخری الفاظ کے ساتھ ہی وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا اور آگ بھی یکلخت بجھ گئی۔ لیکن اس کے آخری الفاظ میرے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگے۔ کیا سکو دیو بچ گیا؟ کیا..... کیا..... وہ مجھے دوبارہ ملے گا؟

میں نے سوالیہ نظروں سے بونوں کی طرف دیکھا۔ وہ میری پریشانی دیکھ کر ایک ساتھ بولے:

ہم نے اسے جلانے کی پوری پوری کوشش کی لیکن آخری وقت پر اُسے پاک کلام نے بچا لیا۔"

"لیکن۔ وہ تو کافر ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"دلوں کا حال تو ذاتِ الٰہی کو معلوم ہے۔" دونوں نے جواب دیا۔

تو کیا اسکو دلِ مسلمان ہے؟ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اپنے پاؤں پر کسی کے سر کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا اصغر میرے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔ میں نے غصّہ سے اُسے ٹھوکر ماری اور دونوں سے کہا کہ وہ مجھے، رانی اور اس کے بچے کو واپس چھوڑ آئیں۔ اصغر رو رو کر مجھ سے معافی مانگتا رہا لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

رانی اور اس کے بچے کی بازیابی سے یہ گھر ایک بار پھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ رانی نے میرے بارے میں جو کچھ بتایا اس نے لوگوں کو صرف حیرت زدہ کر دیا بلکہ میری بھی قدر و منزلت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔

گھر کے تمام لوگ عقیدت و احترام میں میرے آگے پیچھے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب میں دنیاداری رکھ رکھاؤ میں ایسا اُلجھا کہ فقیرانہ وضع قطع کو بالکل ہی بھول گیا۔ ویسے بھی میں نے یہاں آ کر مصروفیات کے پیشِ نظر عبادت و ریاضت کی طرف بہت ہی کم توجہ دی اور اس واقعہ کے بعد تو صبح کی روشنی پھیلنے سے لے آدھی رات تک میرا کمرہ عقیدت مند عورتوں اور مردوں سے بھرا رہتا تھا۔ جب وہ سب چلے جاتے تو میں اتنا تھک چکا ہوتا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔

شاید چھ ماہ گزرے ہوں گے کہ ایک دن ایک حواس باختہ دوشیزہ کو میرے سامنے لایا گیا۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں اور دو جوان بھائیوں کے ساتھ آئی تھی۔ ایسی حواس باختہ یا آسیب زدہ خواتین میرے پاس بہت ہی کم آتی تھیں۔ اور

اگر آبھی جاتیں تو ان میں سے بیشتر گھریلو تنازعات کی وجہ سے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوتی تھیں اور زیادہ تر ہسٹریا کی مریض ہوتی تھیں۔ انہیں میں اپنی قوتِ ارادی سے ٹھیک کر دیا کرتا تھا۔ اور پانی وغیرہ پڑھ کر دے دیا کرتا تھا۔

لیکن اگر کوئی واقعی آسیب زدہ آجاتا تھا تو مجھے آیتِ کریمہ کے توکل سے مدد لینا پڑتی تھی لیکن ایسا صرف ایک یا دو بار ہی ہوا تھا۔ اور وہ بھی رانی اور اس کے بچے اغوا ہونے کے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔

اس دوشیزہ کے اندر داخل ہوتے ہی لوگوں نے سمٹ سمٹ کر جگہ دینا شروع کر دی۔ دوشیزہ بری طرح سے جھوم رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ایک آیت پڑھی۔ اس آیت کے پڑھنے سے بے قرار شخص کو قرار آجاتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اس لڑکی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوشیزہ میرے سامنے دو زانو بیٹھ کر جھومتی رہی۔

میں نے مراقبہ کے ذریعے معلوم کیا کہ اس پر واقعی اثر تھا۔ وہ ایک نہایت ہی شریر جن تھا۔ میں نے پڑھ کر اس کے چہرے پر پھونکیں ماریں، کچھ دیر بعد جن بول اٹھا۔

اس نے بتایا کہ اس لڑکی کے گھر میں چنبیلی کے درخت تھے۔ یہ جن روز صبح ہی صبح ان کی خوشبو کی خاطر دو چار پھول توڑ لیا کرتا تھا۔ کوئی مہینہ بھر قبل جب وہ پھول توڑنے آیا تو اس نے اس لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی بھی پھول توڑ رہی تھی بس نہ جانے اسے اس کی کون سی ادا بھا گئی کہ وہ اس کا عاشق ہو گیا۔

میں نے اس جن سے چلے جانے کو کہا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ میں نے اُسے دھمکیاں دینا شروع کر دیں لیکن پھر بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی سرکشی دیکھ کر میرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر میں نے آیتِ کریمہ کا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا میرا خیال تھا کہ وہ فوراً ہی بھاگ جائے گا لیکن دوشیزہ برابر جھومے جا رہی تھی۔

وظیفہ پڑھتے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ ہو گئے لیکن نہ تو توکل ظاہر ہوا اور نہ ہی

لڑکی کے اوپر کوئی اثر ہوا۔ میں پریشان تھا کہ وظیفہ کا اثر کیوں نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ لیکن نہیں، میں ٹھیک پڑھ رہا تھا۔

اس ناکامی پر مجھے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ اور اس ہی جھنجلاہٹ میں وظیفہ چھوڑ کر حق اللہ کی ضرب لگانے لگا۔ اس ضرب لگانے کا نتیجہ ہوا کہ جن وقتی طور سے چلا گیا اور لڑکی کو قرار آگیا۔

میرا دشمن

مجھے جب ہوش آیا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی میں سے آدھی رات کا چاند نظر آرہا تھا۔ میرا کمرہ خالی تھا۔ لوگ جا چکے تھے۔ اور ان کے لائے ہوئے پھل فروٹ رکھے ہوئے تھے۔

میں نے تنہائی میں سوچا کہ وظیفہ کیوں ناکام ہوگیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ وضو کیا اور مصلّی بچھا کر نفلوں کی نیت باندھ لی۔

نفلوں سے فارغ ہوا تو میں نے ایک بار پھر وظیفہ شروع کر دیا۔ میں وظیفہ پڑھتا رہا پڑھتا رہا اور پھر... مجھے چاروں جانب سے "نفس، نفس" کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں کو سن کر میں اور تیزی کے ساتھ وظیفہ پڑھنے لگا۔ اور۔ اور پھر... میں نے خود کو سامنے کھڑا پایا۔ میرا وجود، میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں وظیفہ چھوڑ کر حیرت سے اپنے وجود کو تکنے لگا۔

میرا سیاہی مائل وجود مجھ سے مخاطب ہوا "خان! اس سے پہلے کہ تم ختم ہو سنبھل جاؤ۔ تم اپنے نفس کے غلام بنتے جا رہے ہو۔

"میں اپنے نفس کا غلام بن گیا ہوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم اپنے اعمال کا جائزہ لو!" میرا وجود بولا "تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے اپنے نفس کے کہنے پر کیا ہے"

"ناممکن — قطعی ناممکن!" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"خان! تم حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے" میرے وجود نے کہا۔ "تمہارا نفس تمہیں برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ تمہاری عبادت و ریاضت ضائع ہوتی جا رہی ہے۔ تمہیں خیر و شر کی پہچان نہیں رہی۔ تم نے سکھ دیو کو جھلسا کر اپنے نفس کو تسکین دی ہے۔"

اس کے بعد میرا وجود دھندلانے لگا۔ اس کے خدوخال بگڑتے چلے گئے پھر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اپنے وجود کے غائب ہوتے ہی میں اس طرح سے چونکا جیسے نیند سے بیدار ہوں — یہ سب کیا تھا!

میں اسے اشارۂ خداوندی ہی کہوں گا۔ حق تعالےٰ کی بھی کیا شان ہے کہ اپنے بھٹکے ہوئے بندوں کو بھی کن کن طریقوں سے ہدایت دیتا ہے!

اس اشارہ کو پاتے ہی میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ واقعی یہاں آ کر میں نفس کا غلام بن گیا تھا۔ نفس نہایت چالاکی سے مجھ پر قبضہ کرتا چلا جا رہا تھا۔

میں یہاں آ کر دنیاوی شان و شوکت میں ایسا کھویا کہ خدا کو بالکل ہی بھول گیا۔ میں جو اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا، اپنے اعمال کی بدولت اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ میری عبادت و ریاضت سب کچھ اسی کے لیے ہوتی تھی لیکن اب وہ سب اپنا روحانی اقتدار قائم رکھنے کی خاطر کر رہا تھا۔

سکھ دیو کے ساتھ میں نے جو کچھ کیا، وہ ایک خدائی عمل تھا لیکن کیا میرا یہ عمل جائز تھا؟ مجھ جیسے انسان کو جو قربِ الٰہی کا خواستگار ہو، اس کی مخلوق کو نقصان پہنچانے کا حق تو نہیں ہے۔ میرے دل میں عجز و انکساری کی جگہ تکبر نے لے لی تھی۔ اسفر مجھ سے معافی مانگتا رہا لیکن میں نے غرور سے اُسے ٹھوکر مار دی تھی۔ سکھ دیو کلامِ مجید پڑھ رہا تھا اور میں خود سے اُسے جہنمی کہتا رہا۔ بو نے جو خیر و شر کا مجموعہ تھے، انہوں نے بھی دل کا حال جاننے سے

مجبوری ظاہر کر دی تھی۔ پھر — پھر، میں کون تھا جو اس کے جہنمی ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ میری حیثیت کیا تھی!

اپنی غلطیوں کا احساس ہوتے ہی میں کانپ اٹھا۔ میں فلسفۂ رُوحانیت کو بھلا بیٹھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری رُوحانی صلاحیتیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ آیت کریمہ کا اثر ختم ہو چکا تھا۔

اور پھر — پھر میں سجدہ میں گر گیا۔

سجدہ میں گر کر میرا دل بھر آیا۔ میں خدا کے حضور میں رو رو کر اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا رہا۔ مجھ پر شرم و ندامت کا شدید احساس غالب تھا۔

کافی دیر بعد، جب میں نے سجدہ سے سر اٹھایا تو ایک بار پھر خود کو ہلکا محسوس کیا۔ میں نے اس دنیا کو چھوڑ کر واپس جنگ تالاب چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ میری اصلی دنیا تو وہی ویرانہ اور مستانی کا ٹھکانہ تھی۔ لیکن میرے ذہن میں ایک دم خیال آیا کہ اپنی دنیا میں واپس جانے سے پہلے ایک بار سکھ دیو سے مل لوں۔ اس کے ساتھ میں نے جو انتہائی غیر مناسب سلوک کیا تھا، اس کی معافی مانگ لوں۔

مستانی کا کہنا تھا کہ حق تعالےٰ درگزر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور میں حق تعالےٰ کو راضی کرنے کی خاطر سکھ دیو کا پیر پکڑنے کو تیار ہو گیا۔

میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کہاں ہو گا، وظیفہ پڑھا۔ اور پھر میری ظاہری و باطنی نگاہ وسیع ہوتی چلی گئی۔

میں نے دیکھا، دہلی کے بیچ درختوں کے جھنڈ میں واقع ایک مندر کی سیڑھیوں پر جھلسا ہوا سکھ دیو لیٹا تھا۔ اس کے پاس ایک بوڑھا سنیاسی بیٹھا زخموں کا علاج کر رہا تھا۔ چھ ماہ گزرنے کے باوجود اس کے زخم نہیں بھرے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ میں نے فوراً ہی اپنی بصیرت کو سمیٹا اور جھکڑ پہنچ کر اس سے معافی مانگنے کا

ارادہ کر لیا۔

سکھر اور روہڑی کے درمیان دریائے سندھ کے بیچ میں ایک جزیرہ ہے یہ ہندوؤں کا نہایت ہی متبرک اور مقدس مقام ہے۔

سکھ دیو تک پہنچنے کی خاطر میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور سانس کے ساتھ "حق اللہ" کی گردان کرنے لگا۔ میں اپنے جسم سے روح کو جدا کرنا چاہتا تھا لیکن کافی دیر گزرنے کے باوجود میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا۔ میری روح نے جسم کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید میری روح میرے اعمال کی وجہ سے بھاری ہو چکی تھی۔ میں نے اس عمل کو ترک کر دیا۔ اور مادی ذرائع سے اس تک پہنچنے کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے گھر والوں کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ مجھے نہیں جانے دیں گے۔

اب جو واقعات میں بیان کر رہا ہوں وہ اس وقت کے ہیں جب پاکستان وجود میں آ چکا تھا اور اس کرۂ ارض پر سب سے بڑا نقل مکانی کا سلسلہ جاری تھا۔

کچھ لوگ اس زمین کو چھوڑ کر جا رہے تھے اور کچھ لوگ اس زمین پر آ رہے تھے۔ اس افراتفری کے زمانے میں کب کسی کو کسی کا ہوش رہتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور سڑکیں سنسان تھیں۔ جو لوگ اس شہر کو چھوڑ کر جا رہے تھے وہ ہندو تھے اور اپنی جانوں کے خوف سے دن ہی کو اسٹیشن چلے جایا کرتے تھے۔

جو مسلمان مہاجرین آ رہے تھے انہیں مسلم لیگی رضا کار دن نکلتے ہی کیمپوں میں پہنچا دیا کرتے تھے۔ غرض جب میں اسٹیشن پہنچا تو چھوٹی لائن کے پار جو کھوکھرا پار سے ہندوستان جاتی تھی، ہندوؤں کا وہاں جم غفیر تھا۔ وہ سب مونا باؤ جانے کے لیے ریل گاڑی کے منتظر تھے۔

ایک چال

وہ بڑی ہی تاریک رات تھی۔ چاروں جانب سناٹا چھایا ہوا تھا اور کبھی کبھی اس سناٹے کو کتوں کے بھونکنے کی آواز توڑ دیا کرتی تھی۔

میں شاہی بازار کی پیچ در پیچ گلیوں سے گزرتا اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی سی گلی کو پار کیا اور ایک دوسری چھوٹی سی گلی میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ ایک شیریں اور دلنواز آواز تھی۔ میں نے اتنی دلکش آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جس نے مجھے خان بابا کہہ کر پکارا تھا۔

میں نے بڑی ہی سادہ اور پاکیزہ زندگی گزاری تھی۔ آج تک میری زندگی میں کبھی کسی عورت کو دخل نہیں رہا۔ رات کے سناٹے میں اپنا نام سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے آواز کی طرف دیکھا اس چھوٹی سی گلی کے درمیان میں ایک نہایت ہی خوبصورت عورت سندھی اجرک سے اپنا جسم چھپائے کھڑی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر پوچھا "کیا تم نے مجھ کو آواز دی ہے؟"

"ہاں، بابا جی!" اس عورت نے نہایت ہی مترنم آواز میں کہا "اس وقت آپ کو دیکھ کر میرا من خوشی سے کھل اٹھا ہے۔ شاید بھگوان نے آپ کو میری رکشا ہی کے لیے بھیجا ہے!"

"بتاؤ، بات کیا ہے!" میں نے پوچھا۔

بتایا گیا کہ یہ ہندو عورت کسی مصیبت میں گرفتار ہے اور میرے معتقدین سے ہے۔ اس وقت مجھے یہاں سے گزرتا دیکھ کر مدد کی طالب ہوئی ہے۔

"آئیے، اندر آجائیے!" اس نے ایک دروازہ کی جانب چلتے ہوئے کہا جو کہ تین چار قدم کے فاصلے پر تھا۔

میں نے سوچا کہ بے چاری مصیبت کی ماری ہے اور شاید کوئی مرد اس کے گھر میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے خراب و خستہ بنے ہوئے دروازے کے کواڑوں کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گئی۔

یہ مکان کافی بڑا تھا لیکن اندر سے بہت پرانا دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے نیچے سے اینٹیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ رنگ بھی میلا سا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ پوری عمارت پر ایک ناقابلِ بیان ویرانی سی بھی مسلط ہو گئی تھی۔

اس عورت نے اس مکان کے صحن کو عبور کیا اور اندر کی جانب بنے ہوئے قطار در قطار کمروں میں سے ایک کمرہ میں داخل ہو گئی۔ میں ابھی صحن کے درمیان ہی میں پہنچا تھا کہ اس ہی عورت کی نہایت ہی شیریں [illegible] آواز سنائی دی "اس طرف اندر آجاؤ!"

میں نے بے سوچے سمجھے اس کمرہ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اور جب میں نے اس کمرہ میں قدم رکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ کمرہ نہایت ہی قیمتی ضروری اشیاء سے سجا ہوا تھا۔ ابھی میں اس کمرہ کی چیزیں دیکھنے میں محو تھا کہ اس عورت نے مخاطب کیا "خان بابا! میں اس وقت ایک زبردست مصیبت میں گرفتار ہوں اور میں نے اسی وجہ سے آپ کو تکلیف دی ہے۔"

"کیا تم اس مکان میں تنہا رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، بابا جی!" اس نے نہایت ہی ملائم لہجہ میں جواب دیا "اس مکان میں اپنی کنواری کنیا کے ساتھ تنہا ہی رہتی ہوں۔"

"ہوں...!" میں نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا "بات کیا ہے؟"

"اس لیے بہت مجبور ہو کر آپ کو تکلیف دے رہی ہوں" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "گھنشا کا اُدپائے آپ ہی کر سکتے ہیں۔ اس دھرتی پر آپ بھگوان کے اوتار ہیں۔ آپ کی شکتی میری

سہارا مل سکتی ہے۔"

اس کی زبان سے تعریفی کلمات سن کر میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور میں نے نہایت ہی تمکنت سے کہا "تم کچھ بتاؤ تو... میں ضرور کچھ کروں گا۔"

"ان داتا!" وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے غم زدہ لہجے میں بولی "میری ایک ہی کنواری کنیا ہے..... اور..... وہ..... اس وقت سخت بیمار ہے۔"

"تمہاری بیٹی کہاں ہے؟" میں نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔

میری بات سنتے ہی وہ تیزی سے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مسہری کے پاس پہنچی۔ اس مسہری پر نہایت دیدہ زیب مچھر کوٹ پڑا ہوا تھا جس کے چاروں جانب سرخ ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ اس عورت نے ہاتھ بڑھا کر سامنے کی جانب کا پردہ ہٹاتے ہوئے کہا "یہ ہے میری کنیا، مہاراج۔"

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک سولہ سترہ سالہ نہایت ہی حسین لڑکی بستر پر محوِ خواب تھی۔ اس کے چہرے پر رعنائیاں ہی رعنائیاں تھیں۔ اس کے حسن میں شباب ہی شباب تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنا حسین چہرہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کے حسن کے سمندر میں ڈوبا ہوا آگے بڑھا اور مسہری کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

مجھے وہ چہرہ جانا پہچانا سا لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن کہاں اور کب دیکھا ہے، یہ مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں چند آسیبی [illegible] ماری۔ میرا خیال تھا کہ اس لڑکی پر کوئی آسیب یا جن بھوت کا سایہ ہے تو ضرور آنکھیں کھول دے گی لیکن نہیں، دوشیزہ اسی طرح بے ہوش لیٹی رہی۔ اس کی سانسوں کے زیر و بم کے علاوہ جسم نے ذرا سی بھی حرکت نہیں کی۔

"یہ کیا بیماری ہے؟" میں نے اپنی ناکامی کو چھپاتے ہوئے کہا "کب سے بیمار ہے؟"

"باباجی!" عورت بولی "یہ آج سے نہیں تین برس سے اسی طرح خاموش لیٹی ہے بابا"

"تین برس سے!" تعجب میں میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں، یہ ناگ دیوتا کا شراپ ہے!" عورت نے جواب دیا اور ہاتھ تک پکڑا ہوا پردہ چھوڑ دیا۔ ریشمی پردے کے پیچھے مسہری پر لیٹی ہوئی دوشیزہ پھر چھپ گئی۔

"کیا مطلب؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹھئے، بتاتی ہوں!" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جب تک بیٹھ گیا تو وہ سامنے کھڑی ہو کر بولی "مہاراج! ایک لمبی کہانی ہے۔ آج سے کئی برس پہلے میں بیاہ کر کے ایک گاؤں میں اپنے پتی دیو کے ساتھ رہا کرتی تھی بھگوان نے بڑی ہی پرارتھناؤں کے بعد مجھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی سے نوازا تھا۔ اس گاؤں کے ایک کنارے پر ناگ دیوتا کا مندر بھی تھا۔ میری بیٹی اپنی سکھیوں کے ساتھ صبح شام وہاں پوجا پاٹ کے لیے جاتی تھی۔ ناگ دیوتا کی یہ ریت ہے" وہ نہایت دکھ سے بولی "کہ جب کوئی کنواری کنیا جوان ہو جاتی ہے تو ناگ پنچمی کے دن اسے ایک سال کے لیے داسی بنایا جاتا ہے۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور پھر ایک ہفتہ بعد ہی جب کہ میری بیٹی سورج ڈھلے کنوئیں سے پانی بھر کر لا رہی تھی، کسی ناگ نے اسے ڈس لیا!"

اتنا کہہ کر وہ عورت لمحہ بھر کو رکی پھر گلوگیر آواز سے بولی: "میں نے فوراً ہی سنیاسیوں اور سپیروں کو بلایا۔ انہوں نے اس کا زہر تو چوس لیا لیکن اسے ہوش میں نہ لا سکے۔ بس جب سے یہ یوں ہی بے ہوش پڑی ہے۔ میں نے اس کا بہت علاج کرایا، بہت علاج کرایا اور میں اسے لے کر یہاں حیدرآباد شہر میں آ گئی۔ یہاں آ کر میں نے نہ صرف ڈاکٹروں اور ویدوں کا علاج کرایا بلکہ بڑے بڑے مہاپرش سادھوؤں کو بھی دکھایا لیکن کوئی بھی اسے ہوش میں نہیں لا سکا۔"

"پھر.....؟" میں نے بے خیالی سے کہا۔

"پھر ایک دن" وہ خلا میں دیکھتی ہوئی بولی، "ایک مہمان گیانی سادھو نے بتایا کہ یہ بے ہوشی دراصل ناگ دیوتا کا شراپ ہے۔ اور اس کا اپائے صرف شیش ناگ کا "من" ہے۔"

"شیش ناگ کا من!" میں نے تعجب سے کہا۔

"مہاراج!" وہ ہندو عورت عقیدت سے بولی "جب ناگ ہزار سال کا ہو جاتا ہے تو اس کے شریر کا زہر ایک روشن گولا بن جاتا ہے اور وہ سیاہ راتوں میں اس 'من' کو منہ سے نکال کر اس کی روشنی میں گھومتا ہے۔ اسی 'من' میں ناگ دیوتا کی وہ شکتی بھی ہوتی ہے کہ اگر کسی مرے ہوئے انسان کو بھی اس کا پانی پلا دیا جائے تو وہ آنکھیں کھول دیتا ہے!"

"تم نے عجیب سی بات بتائی ہے!" میں نے اسی طرح حیرانی سے کہا۔

"مہاراج!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "دھرم گرنتھ میں یہی لکھا ہے۔ شیش ناگ کا من، حاصل کرنا بڑا ہی کٹھن ہے،... بڑا ہی کٹھن، لیکن جو شخص اس دھرتی پر بھگوان کا اوتار ہوتے ہیں ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے!"

"مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں ایک کمزور عورت ہوں!" وہ آبدیدہ ہو کر بولی "مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ کچھ کر سکوں" پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا "آپ گیانی ہو مہاراج۔ آپ میں بھگوان جیسی شکتی ہے۔ میری کنیا کو اس مصیبت سے نجات دلا دو۔ ناگ دیوتا کے شراپ سے بچا لو یا پھر" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "بھگوان سے کہو اسے اپنے پاس بلا لے۔ میں کب تک اس لاش کو یوں ہی سینے سے لگائے رہوں گی!"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کمرے کی خاموش فضا میں اس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس کی التجا نے میرا دل پگھلا دیا۔ میں نے سوچا کہ اب تک میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے تسکینِ نفس کی خاطر کیا اپنے روحانی بھرم کو قائم رکھنے کی خاطر کیا اور اب مجھ سے ایک عورت التجا کر رہی تھی۔ اپنے دکھ کا مداوا چاہتی تھی۔ پھر یہ حسین لڑکی کب تک یوں ہی بے ہوش پڑی رہے گی۔ اس کے معصوم حسن نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ویسے بھی میں سکھ وِیو کے پاس معافی مانگنے جا رہا تھا۔ لیکن اب سوچا کہ پہلے اس نیک کام سے فارغ ہو لوں۔ شاید میری غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی یہ ایک سبیل بھی ہو۔ اور . . . اور پھر میں نے اس عورت کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس عورت نے بتایا کہ تاریک راتوں میں وہ ناگ جھیلی نہر کے کنارے کسی جگہ پر نمودار ہوتا ہے اور پھر اپنے "من" کو نکال کر اس کی روشنی میں سیر و تفریح کرتا ہے۔

اس ناگ کے بارے میں ہر سپیرے سے شہرت تھی۔ کوئی اسے شیش ناگ بتاتا تھا اور کوئی اسے دیوتا کہتا تھا۔ اس ناگ کے بارے میں باتیں پھیلانے والے وہ مچھیرے تھے جو جھیلی نہر میں مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔

میں اس عورت کے ساتھ ہی حویلی میں ٹھہر گیا اور پھر دوسری رات جب کہ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے، میں عزم اور ولولے کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔

میں کبھی بھی اس قسم کے واقعے سے دوچار نہیں ہوا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ شیش ناگ کو کس طرح قابو میں کر کے اس کا من حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بس مجھے خود پر اعتماد تھا۔ بھروسا تھا۔ کہ جانے کس کی لگن کا ایسا جذبہ تھا۔

اس زمانے میں ابن جریر آباد سے لے کر جھیلی نہر کے کنارے تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اور اتنی زیادہ خودرو جنگلی جھاڑیاں تھیں کہ ان میں سے آدمی کا گزرنا مشکل تھا۔ البتہ ان جھاڑیوں میں چند پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں جنہیں دن میں مچھلیاں پکڑنے والے مچھیرے استعمال کرتے تھے۔

میں ان ہی پگڈنڈیوں میں سے ایک لمبی سی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ یہ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی جھیلی نہر کے کنارے کی طرف جاتی تھی۔ ابھی میں کچھ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک زبردست سرسراہٹ سنائی دی، اور اس کے ساتھ ہی دائیں طرف کی جھاڑیوں سے ایک کالے رنگ کی بلی نکلی اور میرے سامنے کی جانب اسی پگڈنڈی پر اس طرح سے بھاگتی چلی گئی جیسے وہ مجھ سے پہلے پہنچنا چاہتی ہو۔ میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بس ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک فضا میں بین کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور بین کی آواز کی طرف دیکھنے لگا۔ پگڈنڈی سے ہٹ کر گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک نہایت ہی سیاہ چمک دار سانپ جس کا قد ایک گز یا اس سے کچھ زیادہ ہو گا، اپنی دم کے سہارے کھڑا بین کی لے پر جھوم رہا تھا۔ اس کے چوڑے پھن پر سنہری بالوں کا ایک چھوٹا سا تاج تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سرخ تھیں۔ اس کا پھیلا ہوا پھن اور سرخ دو شاخہ زبان اس کی ہولناکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔

میں نے بین بجانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ بیس بائیس سال کا ایک خوب رو سپیرا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی قمیص پر سفید دھوتی باندھ رکھی تھی اور سر پر زرد رنگ کی پگڑی تھی۔ اس کے دونوں بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور وہ مستعدی سے بین کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ناگ کے سامنے رقص کرتے ہوئے بجا رہا تھا۔

اس کی وہ بین بڑی ہی دل کش اور مسحور کن تھی۔ وہ ماحول سے بے خبر بین بجا رہا تھا۔ سیاہ ناگ مست ہو کر جھوم رہا تھا اور . . . اور . . . میں ایک بڑی سی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر سب کچھ دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد — اچانک تاریک ماحول چکا چوند کر دینے والی روشنی سے جگمگا اٹھا۔

یہ اس قدر تیز روشنی تھی کہ کوئی بھی شخص آنکھوں کو جھپکائے بغیر نہیں رہ سکتا پھر حیرت سے میری آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ میرے سامنے ایک ناقابل یقین منظر تھا۔

سانپ نے بین کی دھن پر مست ہو کر پنگ پانگ کی گیند سے بھی چھوٹی ایک سفید رنگ کی گول سی چیز منہ سے نکال کر زمین پر ڈال دی۔ یہ اس کا من تھا۔ من کے زمین پر گرتے ہی قریب کی ایک جھاڑی کے پیچھے سے عورت برآمد ہوئی۔ شاید وہ اس موقع کی منتظر تھی۔

اس عورت کے دائیں ہاتھ میں کانسی کی ایک بڑی سی تھالی تھی۔ اس تھالی میں ایک درجن سے زیادہ گھی کے چراغ جل رہے تھے۔ وہ عورت ہاتھ میں تھالی لیے ہوئے ناگ کے سامنے رقص کرنے لگی۔ اس کا پورا جسم سیاہ تھا، بالکل ناگ کی مانند۔ اور وہ بین کی دھن پر ناگن ہی کی طرح لہرا رہی تھی۔

ایسا رقص میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ماحول نہایت ہی پُراسرار ہو گیا تھا۔ اور وہ عورت ــ عورت کے بجائے ناگن نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضو کی بین کی لے پر ناگ کی طرح لہرا رہا تھا۔

وہ عورت ناگ کے چاروں جانب رقص کرتے ہوئے گھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا سحر تھا۔ ناگ بھی اس کے ساتھ ہی گھوم رہا تھا۔ عورت کی کوشش تھی کہ ناگ کی توجہ زمین پر پڑے ہوئے 'من' سے ہٹ جائے۔ پھر بین کی لے بدل گئی۔ اس کی دھن بار بار بلند ہو کر آہستہ ہو جاتی تھی اور ساتھ ہی رقص کرتی ہوئی عورت کبھی زمین پر بیٹھ جاتی تھی اور کبھی کھڑی ہو جاتی تھی۔

بین کی دھن اور عورت کے رقص کے ساتھ ہی ساتھ ناگ بھی اسی طرح سے حرکت کر رہا تھا۔ پھر بین کی دھن آہستہ ہوتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی عورت اور ناگ بھی بیٹھنے لگے۔ پھر عورت نے رقص کرتے ہوئے تھالی زمین پر رکھ دی۔ تھالی میں دودھ تھا اور اس کے کناروں پر گھی کے چراغ جل رہے تھے۔

ناگ نے جوں ہی دودھ پینے کی خاطر تھالی میں منہ ڈالا، اس عورت نے مٹی کی ایک پکی ہانڈی تیزی سے من پر اوندھا دی۔ ماحول ایک دم تاریک ہو گیا۔ ناگ نے غضب ناک ہو کر اپنا سر اٹھایا۔ فضا میں "فوں" کی خوفناک آواز گونجی۔ پھر اس کے منہ سے شعلے سے لپکے اور تھالی میں رکھے ہوئے تمام چراغ گل ہو گئے۔

رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ عورت نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ مٹی کی ہانڈی پر جگہ جگہ کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ اور ناگ دیوانہ وار اپنا پھن اس ہانڈی پر مار رہا تھا۔ وہ جب بھی ایسا کرتا تھا زخمی ہو جاتا تھا۔ چند منٹ بعد... اس نے آخری سر اٹھایا اور پھر پوری قوت سے ہانڈی پر دے مارا۔ فضا میں دھپ کی آواز بلند ہوئی۔ شیش ناگ کا جسم ایک بار اکڑا اور پھر اس میں کئی بل پڑ گئے۔ وہ مر چکا تھا۔

سپیرے نے ایک لکڑی سے اسے ہانڈی سے دور ہٹایا اور پھر ہانڈی کے نیچے ہاتھ ڈال کر 'من' اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی ماحول لمحہ بھر کے لیے روشن ہو گیا۔ پھر اس نے ایک چھوٹے سے رومال میں 'من' کو لپیٹا اور اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں جھاڑی کے پیچھے سے نکلا اور اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر زیرِ خند سے بولا: "کون ہو تم، کیوں آئے ہو؟"

"یہ من مجھے دے دو۔" میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا: "مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔"

"واہ، یہ بھی خوب رہی۔" اس نے فضا میں ہاتھ نچا کر غصہ سے کہا: "جان جوکھوں میں ڈال کر میں نے اسے حاصل کیا اور تمہیں دے دوں!"

"مجھے ایک انسان کی جان بچانی ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"تو میں کیا کروں!" اس نے لاپروائی سے کہا۔ اور تھیلے پر گرفت مضبوط کر کے چل دیا۔

"ایک لڑکی تین سال سے بے ہوش ہے!" میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

اس کی ماں نے بتایا ہے کہ اگر شیش ناگ کی ... من مل جائے تو وہ پھر پہلے جیسی ہو سکتی ہے۔"

"اگر مجھے اس نے ابتدا ہی میں صرف اسی توجہ سے پہلے آگاہ کیا ہوتا" اس نے نہایت ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں اسی مقصد کے لیے آرہا تھا جیسا میں نے بتایا لیکن تم مجھ سے پہلے پہنچ گئے اور......"

"یہ تو بھگوان کی دین ہے" اس نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے چاہیے جو چاہے کرنے والے ..."

یہ سن کر ایک بار تو جی میں آیا کہ اسے بتاؤں کہ مجھ میں الٹی طاقت ہے اور خدا مجھ سے یہ کام لینا چاہتا ہے لیکن پھر مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ اب مجھ میں پہلی جیسی روحانی طاقت نہیں رہی ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ حقارت سے بولا "چل اپنی راہ لے۔"

"نہیں... نہیں، ایسا نہ کرو" میں نے خوشامد سے کہا۔ "میں اس لڑکی کے لیے امرت لینے آیا ہوں مجھے دے دو۔ یہ اس کے لیے سب سے بڑی خیرات ہے۔"

یہ بات سن کر اس نے غور سے میرے چہرے کو دیکھا اور پھر نہایت ہی عجیب انداز سے پوچھا "کیسی ہے وہ لڑکی؟"

"بڑی ہی خوبصورت ہے" بالکل بے اختیاری طور پر میں نے کہا۔

"مجھ سے شادی کرے گی؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس ناک چمک پیدا ہو چکی تھی۔ نجانے کیوں مجھے اس بات پر غصہ سا آگیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ انسان کو انسان کے کام آنا چاہیے۔"

"اس دھرتی پر کوئی کسی کے کام بغیر مطلب کے نہیں آتا۔" اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ میرے نفس کی آواز تھی۔

میں تو اس لڑکی کے حسن سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگا کہ کچھ نیکی حاصل کرنے چلا آیا ہوں لیکن یہ شخص ... سے بھی گیا گزرا ... پہلے ہی کی طرح تار رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا "اس لڑکی پر مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"اگر اختیار نہیں ہے تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ نہایت ہی کراہت آمیز تبسم سے بولا۔ "تم اس کی سندرتا پر مرتے ہو۔ تم اس پر احسان کر کے اسے جیون بھر کے لیے غلام بنانا چاہتے ہو۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ شخص انتہائی مطلب پرست ہے اور مجھ کو بھی اپنا ہی جیسا سمجھ رہا ہے لہٰذا میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی خاطر کہا "نہیں ایسا نہیں ہے ... دنیا میں کوئی کسی کے لیے بنا لالچ کے کچھ نہیں کرتا۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا اور پیٹھ موڑ کر چل دیا۔

اس کے اس رویے کی میری نظر اس پیالے پر پڑی جس کے اندر وہ امرت بھرا ہوا تھا نجانے کیا ہو گیا میرا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھ گیا۔ پیالے پر ہاتھ پڑتے ہی وہ پلٹا اور نہایت ہی نفرت سے بولا "مورکھ! تو کیسا منش ہے جو تیری قسمت کا پھل ... چاہتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دایاں ہاتھ گھما کر میرے منہ پر مار دیا۔ ... کے مطابق یہ نہایت ہی گندی گالی تھی۔ اس کی اس حرکت پر میں ایک دم آگ بگولا ہو گیا اور زور سے ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ میرے اس غیر متوقع حملے سے وہ سنبھل نہیں سکا۔ اس کے منہ سے ایک زبردست غراہٹ نکلی۔ اس نے زمین پر گر کر اپنا ... پکڑ لیا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے خون کی باریک سی دھار بہ نکلی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے زمین پر سے میری ٹانگوں میں اپنا ... اور مجھے گرا دیا۔ اب ہم دونوں زمین پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے تھے۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرا حریف غیر معمولی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر

دے کر مجھے نیچے گرا دیا اور سینے پر چڑھ بیٹھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے منوں بوجھ تلے دب گیا ہوں۔ میرا سانس رکنے لگا۔ اور آنکھیں اُبل پڑیں اسی لمحہ وہ میرے سینے سے اتر گیا جیسے مجھے سنبھلنے کا موقع دے رہا ہو۔ میں نے لیٹے لیٹے سانس درست کی اور پھر اس پر چھلانگ لگا دی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس کے دونوں ہاتھوں میں اس طرح تھا جیسے بلی چوہے کو دباتی ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر سے بلند کیا اور یہ کہتے ہوئے اچھال دیا "کیوں اپنی جیون ہتیا کرنے پر تلا ہوا ہے"۔

زمین پر گرتے ہی میں نے اپنی کمر پکڑ لی۔ کمر میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور..... اور.... پھر مجھے خود پر قابو نہ رہا۔ غصہ کی نہایت ہی شدید حالت میں بے اختیار میرے منہ سے "حق اللہ" نکلا اور ساتھ ہی انگلی بھی اٹھ گئی۔

"حق اللہ" کی آواز کے ساتھ ہی اس نے ایک کربناک چیخ مار کر اپنی گردن پکڑ لی اور "مر گیا مہاراج" کہتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ میرا دل اس کامیابی پر خوشی سے جھوم اٹھا۔ ابھی میری زبان میں تاثیر تھی۔ میں نے فخر و غرور سے تڑپتے ہوئے سپیرے پر نظر ڈالی اور پھر... کپڑے کا تھیلا اٹھا کر جس میں من تھا، واپس چل دیا۔

ابھی میں پانچ دس قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے یک ساتھ بہت سی بلیوں کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چلتے چلتے اطراف میں نظر ڈالی لیکن کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بہت سے سانپوں کی پھنکار سنی تھی۔ ان کے رینگنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے ہوسان درست کیے اور تیز تیز دوڑنے لگا۔

میں نے دوڑتے ہوئے پکے قلعو کی چڑھائی کو عبور کیا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی میری جانی پہچانی تھی۔ اسکول کے زمانے میں اس گلی سے گزرا کرتا تھا۔ میں اپنے خیال کے مطابق اس گھر کی طرف جا رہا تھا جس میں وہ عورت اپنی بے ہوش بیٹی کے ساتھ رہتی تھی۔

لیکن یہ کیا! وہ گلی تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ میں نے کئی گلیوں کو پار کیا تھا اور اب مجھے مطلوبہ گلی میں ہونا چاہیے تھا۔

میں نے ایک بار پھر گلیوں کا چکر لگایا اور ہر گلی میں محراب دار دروازہ کو تلاش کیا۔ لیکن مجھے اس مکان کا دروازہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اب رات ختم ہونے کو تھی نیلے آسمان کے افق پر صبح کے ستارے نے جھلملانا شروع کر دیا تھا۔ اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد میں کچھ جھنجلا گیا اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر نگ کا من نکالا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس عورت کا مکان یہیں کہیں قریب ہوگا تو من کی چکا چوند کر دینے والی روشنی میں مجھے بخوبی نظر آ جائے گا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ من کے بجائے بھربھری مٹی کی ایک ڈلی میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی۔

یہ کیا ہوا! میں نے سوچا۔ میں تو سپیرے سے من چھین کر بھاگا تھا۔ پھر یہ مٹی کی ڈلی کہاں سے آ گئی! میرے مزاج میں ایک بار پھر جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی اور میں نے مٹی کی وہ ڈلی سامنے والے مکان کی دیوار پر دے ماری۔

اس کے ساتھ ہی کوئی بہت دور... بہت ہی زور سے ہنسا تھا جیسے وہ میری ناکامی پر خوش ہوا ہو۔ پھر میرے کانوں میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ یہ ہنسی تو بالکل سکھ دیو کی آواز جیسی تھی۔ میں نے چونک کر چاروں جانب نظر ڈالی اور پھر اپنی بے وقوفی پر خود ہی مسکرانے لگا۔ سکھ دیو یہاں کہاں۔ وہ سکھر میں اپنے زخموں کی مرہم پٹی کر رہا ہے۔

سکھ دیو کا خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ میں یہاں کس چکر میں پڑ گیا ہوں۔ مجھے تو سکھ دیو کے پاس سکھر جانا ہے۔ "جہنم میں جائے وہ عورت" میں غصہ سے بڑبڑایا اور پھر میرے قدم خود بخود اسٹیشن کی طرف اٹھتے چلے گئے۔

آخری حسرت

اس زمانے میں ریل گاڑیاں بھی پابندیٔ وقت سے نہیں چلا کرتی تھیں کیوں کہ ہندوستان میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اور اگر کوئی گاڑی صحیح و سالم پہنچ بھی جاتی تھی تو اس کے آنے اور جانے کا وقت مقرر نہیں تھا۔ کراچی سے ہم ہندو آتے تھے لیکن ہندوستان ریل گاڑی کے آنے تک چھوٹی لائن کی طرف بھیج دیتے تھے کیوں کہ لٹے پٹے مہاجر یہاں آ رہے تھے وہ کسی حد تک مشتعل تھے۔ اور اس طرح بڑی لائن کا پلیٹ فارم سنسان رہتا تھا۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔

میں اسٹیشن پہنچ کر یوں ہی سیر گشت کرنے لگا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کراچی جانے والی کوئی گاڑی آ جائے تو اس میں بیٹھ جاؤں۔ میں ٹہلتا ہوا اس طرف نکل گیا جو بیت الخلا بنے ہوئے تھے جہاں روشنی برائے نام تھی۔ میں نے دیکھا کہ بیت الخلا سے ذرا فاصلہ پر کوئی اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا ہے۔ میں دیکھنے کی خاطر آگے بڑھا تو مجھے دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔ میں اور آگے بڑھا۔ یہ کوئی لڑکی یا عورت تھی جو تاریکی میں بیٹھی رو رہی تھی۔

میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا۔ میں اور آگے بڑھا۔ میری آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا۔ اور حیرت و خوشی سے چلا اٹھا: شانو!"

لڑکی نے چند سیکنڈ میری طرف دیکھا۔ پھر اپنے گلابی رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے

بولی: "میں شانو نہیں، دھنو ہوں۔"

"تم۔ تم۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے اسی حیرت سے پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ شانو ہی ہے۔

"اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کیا ہوا!" میں نے پوچھا۔ میری نظروں کے سامنے دس گیارہ سال پہلے کا واقعہ گھوم گیا جب اسی طرح غیر مناسب حالات میں شانو تک پہنچ گیا تھا۔ اور میں نے اس سے ویرانے میں رہنے کی وجہ پوچھی تو اس نے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تھی۔ وہ خود مر چکی تھی۔ اور اس کی روح مجھ سے طالب تھی۔ موت کے وقت شدید خواہش کی تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے اس کی روح بھٹک رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اس وقت بھی شانو کی روح نے کوئی ڈھونگ رچایا ہو۔

اس نے بتایا کہ وہ سکھر سے ماں باپ کے ہمراہ آئی تھی ان کا ارادہ تھا کہ میرپور خاص کے راستے ہندوستان چلے جائیں گے لیکن جب پولیس گھسنے تک چھوٹی لائن کی گاڑی نہیں آئی تو ان سب نے کراچی کے راستے بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ماں باپ کراچی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے اور بہت زیادہ رش ہونے کی وجہ سے وہ سوار نہ ہو سکی۔

یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے اسے دھارس بندھائی اور یقین دلایا کہ میں اسے بحفاظت کراچی پہنچا دوں گا۔

میری اس تسکین دہانی پر اس لڑکی کی بھی ہمت بڑھی اور وہ میرے ساتھ چلنے کی خاطر کھڑی ہو گئی اور جب تیز روشنی میں آئے تو میں نے دیکھا وہ بہت زیادہ شانو سے ملتی تھی لیکن وہ شانو نہیں تھی۔

قارئین!

اب اس داستان کا عبرتناک حصہ شروع ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی اس داستان کے

اختتام کا آغاز بھی ہے ۔۔ میں اس حصّہ کو بہت ہی مختصر بیان کر رہا ہوں۔

میں دھنو کو لے کر کراچی آگیا۔ دھنو نے بتایا کہ اس کے ایک بہت دور کے رشتہ دار گرومندر کے آس پاس کہیں رہتے ہیں ہم انہیں تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے لیکن وہ لوگ بھی جا چکے تھے اور وہاں دروازہ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے تالا توڑا۔ اور دھنو کے ہمراہ اس مکان میں رہائش اختیار کرلی

رہائش کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اس کے ماں باپ کی تلاش شروع کردی۔ میں ہر روز ایک ہفتہ تک دھنو کے ہمراہ کیماڑی جاتا رہا۔ یہاں بھی ترکِ وطن کرکے جانے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ ہم دونوں نے گودی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا لیکن اس کے ماں باپ کو نہ ملنا تھا، نہ ملے۔ وہ کشتی، اسٹیمر یا کسی اور چھوٹے موٹے جہاز سے چلے گئے تھے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، دھنو ہندو تھی ۔۔ وہ جن حالات میں مجھے ملی تھی، ان کا تقاضا تھا کہ میں اسی کے ساتھ ہی رہوں۔ میں نے ایک دو بار سوچا بھی کہ اپنی راہ لوں لیکن دھنو کی معصوم جوانی نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں جانتا تھا کہ افراتفری کے اس دور میں کوئی بھی اُسے غلط راہ پہ ڈال سکتا ہے۔

دھنو کے ساتھ رہ کر بہت ہی جلد فکرِ معاش نے مجھے ستانا شروع کردیا۔ میں تو بس ایک خالی انسان تھا۔ جس کے پاس نہ دولت تھی اور نہ ہی کوئی ہنر تھا۔ صرف تعلیم تھی۔ لیکن اس زمانے میں اس تعلیم سے بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت سرکاری دفاتر کی تعداد محدود تھی اور جو تھے بھی وہ مہاجروں کی آمدورفت کی وجہ سے بند پڑے تھے۔

معاش کے مسئلے کو دھنو نے اپنا زیور بیچ کر حل کردیا۔ گو کہ اس کا زیور بہت زیادہ نہیں تھا وہ اتنا قیمتی تھا کہ اسے بیچ کر جو پیسے ملے تھے، وہ اتنے زیادہ تھے کہ ہم دونوں کئی برس تک نہایت ہی ٹھاٹ کی زندگی گزار سکتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ دھنو نے سب سے پہلے غذائی ضروریات کا بندوبست کیا۔ اور

پھر آہستہ آہستہ گھر گرہستی بنانا شروع کردی۔ مجھے بھی گرہستی سے دلچسپی ہونے لگی۔ میں بھی اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا۔

میں نے اپنے لیے اور دھنو کے لیے نیا لباس خرید لیا تھا۔ پیسے زیادہ ہونے کی وجہ سے غیر ضروری اشیاء بھی خریدا کرتا تھا۔ اس زمانے میں جو لوگ یہاں سے جا رہے تھے۔ وہ اپنی قیمتی اشیاء سستے داموں فروخت کر دیا کرتے تھے اور میں اکثر و بیشتر ایسی چیزیں خرید لیا کرتا تھا۔

اس ہی طرح جب میں نے ایک بار کچھ سامان خریدے تو ان میں سے پتھر کی بنی ہوئی ایک نہایت ہی خوبصورت مورتی بھی نکل آئی۔ مورتی دیکھ کر دھنو خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے اسے کپڑے سے صاف کیا۔ دودھ سے نہلایا اور گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر کمرے کے ایک طاق میں سجا دیا۔

ایک رات مجھے دھنو کے کمرے سے گانے کی آواز سنائی دی۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور اس طرف چل دیا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ آواز کیسی ہے۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ مورتی کے سامنے رقص کرتی ہوئی بھجن گا رہی تھی۔ کمرے میں برقی قمقمہ روشن تھا اور اس روشنی میں اس کا جسم سنگِ مرمر کی طرح چمک رہا تھا۔

اسے میرے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ وہ مورتی کے سامنے والہانہ انداز میں رقص کرتی رہی۔ وہ نہ جانے کب سے اس ہی طرح رقص کر رہی تھی۔ اس کے بدن پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میرے دل میں پہلی بار ایک لہر سی اٹھی اور پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے یہ رقص پہلی بار دیکھا تھا۔ دل نے چاہا کہ دھنو اس ہی طرح رقص کرتی رہے۔

صنفِ نازک کیا ہے، اس کے دم سے اس کائنات میں کتنی رونق ہے، مجھے پہلی بار

احساس ہوا کہ میں ایک انمول نعمت سے محروم ہوں۔

[illegible] کی [illegible] وہ دین [illegible] کی [illegible] سے [illegible] میں [illegible] مسلمانی کا
ہو رہا اور اس طرح میں نے اپنی زندگی کے انتہائی قیمتی دن " تارک الدنیا " ہو کر گنوا دیئے
مجھ سے زیادہ کم عقل اور مجھ سے زیادہ بے وقوف کون ہوگا جس نے اس دنیا کا مزہ
چکھنے سے قبل ہی [illegible] دنیا [illegible] اور اس دنیا کی رنگینیاں پہلی بار سامنے آئیں تو
مجھے اپنے ماضی پر افسوس ہونے لگا۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب بھلا کون ہوگا جو اس دنیا میں
رہتے ہوئے بھی اس کی لذتوں سے فیض یاب نہیں ہوا۔

[illegible] حقیقی ہے [illegible] اس دنیا کے خالق نے انسانی فطرت کے پیش نظر اس
میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں رہنے دی۔ اور انسان کو اختیار دیا کہ وہ جس طرح چاہے اس کی نعمتوں
سے فائدہ اٹھائے۔

میں گزرے ہوئے دنوں پر پچھتا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی میرے دل و دماغ میں وہ تمام
جذبات بیدار ہو رہے تھے جو فطرت کے عین مطابق ہیں۔

دھنو نے کب اپنا رقص ختم کیا۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں تو اس دیوی کو دیکھنے میں محو
تھا۔

رقص ختم کرنے کے بعد وہ مورتی کے سامنے سجدے میں گر گئی۔

" دھنو.... ! میں نے جذبات سے کپکپاتی آواز میں پکارا۔

دھنو نے سجدے سے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر [illegible] انداز سے مسکرائی۔ اور
پھر مجھے [illegible] سے اشارہ کرتی ہوئی دوبارہ سجدے میں گر گئی۔

دھنو کی مسکراہٹ نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ اس نے
آنکھ کے اشارے سے مورتی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو کہا تھا۔ تو میں .... میں اس
کی خوشنودی کی خاطر مورتی کے سامنے سجدے میں گر گیا ـــــ

ان داتا

تُف غلط خیال تھا میرا !
کتنا سفلی ذہن تھا میرا !
کاش، اس وقت میں اپنے نفس پر قابو پا لیتا! شیطان کے بہکانے میں نہ آتا!

ابھی میں سجدے میں ہی تھا کہ کمرے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ساتھ ہی قہقہہ بھی
بلند ہوا۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سکھ دیو کمرے کے درمیان میں کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔ یقین
جانئے جس طرح ایک بار سکھ دیو مجھے اپنے سامنے اچانک دیکھ کر اچھل پڑا تھا، وہی حال اس
وقت میرا ہوا تھا۔

میرے ساتھ ہی دھنو نے بھی سکھ دیو کو دیکھا اور .... ان داتا کہہ کر اس نے اپنا
سر سکھ دیو کے قدموں میں رکھ دیا۔

دھنو کی یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا " یہ کیا حرکت
ہے۔ تم ایک انسان کو سجدہ کر رہی ہو؟"

" اور ــ تو جو .... ابھی ایک مورتی کو سجدہ کر رہا تھا؟ " سکھ دیو نے طنزیہ ہنس
کر پوچھا۔

" میں سجدہ نہیں کر رہا تھا۔" میں نے برجستہ جواب دیا۔ میری دینی حمیت بیدار ہو گئی۔
" یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" سکھ دیو نے آنکھیں نکال کر کہا۔ " انسان ہو کر بے جان چیز کے

کو دھتکار دیتا ہے۔"

"تمیز سے بات کرو۔" میں نے اس کے طنز پر تلملا کر کہا تھا۔

"ادھر سے پتھروں کو سجدہ کرنے والا مجھے سبق پڑھانے چلا ہے۔" سکھ دیو نے فلک شگاف قہقہہ لگا کر پھر طنز کیا۔

"تم ... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے کھسیانا ہو کر پوچھا۔

"لو بھلا یہ بھی بتانے کی بات ہے۔" وہ فضا میں ہاتھ لہرا کر بولا "پچھلے دنوں تم نے جو مجھے شکست دیا تھا، اب اس کا حساب کرنے آیا ہوں۔" پھر وہ زہرخند سے بولا "کیا آپ کو سب کچھ بتانا ہوگا ---!"

اور ... اور ... واقعی، میں تو سب کچھ بھول چکا تھا۔ میں گھر سے نفس کو کچلنے کی خاطر نکلا تھا۔ میں تو سکھ دیو سے معافی مانگنے جا رہا تھا لیکن دھنو کے چکر میں پڑ کر ایک بار پھر راستے سے بھٹک گیا تھا۔ کیا --- کیا --- نفس اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا ....!

مجھے خاموش دیکھ کر سکھ دیو عیاری سے بولا "کیا سوچا کر رہے ہو، خان!"

"سکھ دیو!" میں سنجیدگی سے بولا "میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا، اس پر مجھے شرمندگی ہے۔" میں نے ایک بار پھر حالات کو سنبھالنا چاہا۔

"اب ... وقت گزر چکا ہے خان!" وہ حقارت سے بولا "غلطی معاف کرنا میں نے نہیں سیکھا۔"

"کیا مطلب ...؟" میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اس دھرتی پر ایک ہی شکتی وان رہ سکتا ہے۔" وہ غرور سے بولا "اور اب وقت آ گیا ہے کہ فیصلہ کر لیا جائے۔"

او ہو! تو یہ بات ہے۔ یہ سنتے ہی جھرجھری سی آ گئی۔ دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ روحانی دنیا میں میرا رقیب بھی پیدا ہو چکا ہے۔

"کیوں خان، یاد آیا!" سکھ دیو نے اسی طرح حقارت سے پوچھا۔

میں نے دل ہی دل میں ایک وظیفہ پڑھا لیکن اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ میری روحانی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ میری ماورائی طاقتیں گم ہو چکی تھیں۔ میں تو لٹا لٹایا بس ایک انسان تھا ایک عام سا بے بس اور مجبور انسان۔ نفس نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ شیطان نے مجھے عرش سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیا تھا۔ اور ایک عام سا انسان جب اپنے سامنے طاقت کو دیکھتا ہے تو خوشامد کا ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ میں نے وہی حربہ استعمال کیا اور بولا "پرانی باتوں کو چھوڑو۔ ہم دوست بن کر بھی رہ سکتے ہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"دوست ...؟" اس نے نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا "اس دھرتی پر میری صرف ایک ہی دوست تھی (اس کا اشارہ مستانی کی طرف تھا)۔ میں اس سے پریم کرتا تھا۔ جس کی عزت کرتا تھا اس لیے کہ وہ جنم جنم سے بھگوان کی اوتار تھی۔ اس نے بھگوان کے پریم میں اپنا جیون تیاگ دیا تھا۔ اور تم --- تم پریم کو کیا جانو! تم --- تم تو --- ایک حقیر سے کیڑے ہو ---!"

"کسی کو حقیر سمجھنا اچھا نہیں۔" میں نے اسے خوشامد سے سمجھایا "اس دنیا میں کوئی حقیر نہیں۔"

"خان! جب تم نے حویلی میں شکست دیا تھا تو میں نے تمہیں اخلاق کا درس نہیں دیا تھا۔" وہ تکبر سے بولا "لیکن اسی دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں تباہ کرنا ضروری ہے۔ ہوں کہ تم گیان دھیان کیا جانو! تمہاری مثال تو اس کتے کی طرح ہے جو روٹی کے ٹکڑے کی خاطر اپنے مالک کا در چھوڑ دیتا ہے۔"

سکھ دیو نے کتنی صحیح مثال دی تھی۔ میں نے دنیا کی خاطر اپنے رب کا در چھوڑ دیا تھا۔ اپنی منزل کا ٹھکانہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ وہ اسی طرح زہر بھری بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہیں تباہ کرنے

کی خاطر مجھے بڑے ہی جتن کرنے پڑے ہیں۔ مجھے قدم قدم پر تیری نگرانی کرنی پڑی ہے۔" پھر اس نے قدموں میں پڑی ہوئی دھنو کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور شیطانی قہقہہ لگا کر بولا۔ "اسے پہچانو خان! یہ میری داسی شانو ہے۔"

میں نے اس کے متوجہ کرنے پر غور سے دھنو کو دیکھا۔ وہ شانو ہی تھی۔

"میری اس داسی کو تمہارے پیر نے بلی کے جسم میں قید کر دیا تھا لیکن اس کے وجود اس کی بیاکل آتما کو چین نہیں تھا۔ اور تمہارے پیر کے سورگ باش ہونے کے بعد پھر میرے پاس چلی آئی اور میں نے اسے تمہارے کام پر لگا دیا۔" سکھ دیو نے بڑے ہی فخر سے بتایا۔ پھر اس کی جانب تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس نے بڑا ہی کام کیا ہے۔ بڑا ہی کام۔ اور اب اس کام کے عوض اس کی آتما کو چین مل جائیگا۔"

یہ کہہ کر سکھ دیو نے اپنے سر کے بالوں میں سے ایک بال توڑا۔ اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور شانو کے گلے میں ہار کی مانند ڈال دیا۔

شانو کے چہرے پر خوشی اور مسرت دوڑ گئی۔ اس نے دوبارہ جھک کر سکھ دیو کے چرنوں کو چھوا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مجھے یہ جان کر سخت غصہ آیا کہ سکھ دیو نے اپنی داسی کے ساتھ مل کر مجھے تباہ کر دیا لیکن اس میں سارا قصور میرا ہی تھا۔ اگر میں نفس کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا تو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔ اگر میں دنیاوی آسائشوں میں نہ پڑ جاتا تو سکھ دیو کی کیا مجال تھی کہ وہ مجھے تباہ کر دیتا۔ میرے تکبر سے، میرے غصے سے میرے نفس کی کمزوری سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ جان چکا تھا کہ روحانی دنیا میں، میرے مزاج کے مطابق، میری حیثیت بچے کی طرح ہے۔ جسے کھلونے دے کر بہلایا جا سکتا ہے۔

اگر مستانی زندہ رہتی، تو ممکن تھا کہ وہ مجھے اس دنیا کا کچھ تو ذہن رکھنے والا باسی بنا دیتی

لیکن — میں تو ظاہری شان و شوکت میں ایسا کھویا کہ اس کی تمام ہدایات کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ مستانی کے یہ الفاظ میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ "خان! اپنے نفس کو قابو میں کر۔ اس نے بڑے بڑے زاہدوں کو راندۂ درگاہ خداوندی کر دیا ہے۔"

لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔ وقت گزر چکا تھا اور سکھ دیو میرے سامنے چٹان کی مانند سینہ تانے کھڑا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اب کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کے باوجود وہ انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔

سکھ دیو نے کچھ پڑھ کر میری طرف پھونکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ میں نے تکلیف سے چیختے چلاتے ہوئے اس کی منت سماجت شروع کر دی۔ سکھ دیو میں ابھی شرافت باقی تھی۔ میرے اس طرح چیخنے چلانے پر اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر نہایت غرور سے بولا۔ "خان! میں سمجھتا تھا کہ تم کچھ نہ ہو کر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہو گے لیکن اب معلوم ہوا کہ تم تو فقط مٹی کا ڈھیر ہو۔ اور یہ میری شان کے خلاف ہے کہ مٹی کے ڈھیر کو روند ڈالوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے دوسری پھونک ماری جس سے میرے جسم کو قرار آگیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے انگلی کا اشارہ کیا جس سے میں زمین پر بیٹھتا چلا گیا جیسے میرے جسم کی جان نکل گئی ہو۔ پھر وہ نہایت فاتحانہ انداز میں بولا۔ "میرا یہ کشٹ تم کو عمر بھر رلاتا رہے گا۔ آج سے تم کوڑھی بن کر دَر دَر کی بھیک مانگتے پھرو گے۔"

پھر آخر میں اس نے ایسی بات بتائی جسے یاد کر کے مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے۔

اس نے کہا۔ "خان! ممکن ہے اب ہم جیون بھر نہ مل سکیں لہٰذا میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مستانی کا پتا میرا گرو تھا، میرا پیر و مرشد تھا۔ میں نے اپنا جیون اس کے پیروں تلے گزارا۔ میں جو کچھ بھی ہوں، اسی کی بدولت ہوں۔ میں اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پیر و مرشد کا کہنا تھا کہ میں اپنا مسلک ترک کر دوں جب کہ مجھے بندہ دھرم صرف اس وجہ سے

پیار اتنا کہ جہاں میری بے پناہ عزت تھی۔ بس یہی ایک اختلاف تھا"

اس کے بعد سکھ دیو چلا گیا۔ وہ پھر کبھی نہیں دکھائی دیا۔ اور میں کوڑھی بن کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔

خان نے آخری جملہ ادا کر کے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے وہ رو رہا تھا۔

عرضِ مُصنف

یوں تو یہ داستان یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک خان کے انجام کا علم نہ ہو تشنگی سی باقی رہتی ہے۔ اور یوں اس داستان کا آخری باب ابھی باقی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کو خان کے انجام سے آگاہ کروں، بہتر سمجھتا ہوں کہ خان سے اپنی ملاقات کا حال سنا دوں۔

خان سے میری ملاقات نہایت ہی ڈرامائی انداز میں گرومندر کے چوراہے پر ہوئی۔ میں صدر جانے کے لیے بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ کسی نے میری پتلون کا پائنچہ پکڑ کر کھینچا۔ میں نے دیکھا کہ ایک فالج زدہ شخص نہایت کمزور آواز میں مجھ سے پانی پلانے کو کہہ رہا ہے۔ وہ نہ جانے کب سے پیاسا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔ اور سینے سے نیچے کا تمام دھڑ مفلوج تھا۔ وہ شخص نہایت ہی سسکتی ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک جھونپڑے میں بنے ہوئے ہوٹل سے لا کر پانی پلایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہندو مسلم فسادات میں زخمی ہو کر مفلوج ہو گیا ہے لیکن جب میں نے پوچھا تو اس نے جو عبرتناک داستان سنائی وہ آپ بھی پڑھ چکے ہیں۔

خان کا انجام

میں ہر روز ہی گرومندر سے صدر بس کے ذریعے جایا کرتا تھا۔ اور اس طرح خان سے میری شناسائی ہو گئی۔

پھر ایک دن اس نے مجھ سے التجا کی میں اُسے رکشہ یا ٹیکسی میں بٹھا کر اُس مزار تک پہنچا دوں جو ٹاور کے آخری سرے پر واقع ہے۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اس ولی کی چوکھٹ سے ضرور صحت یاب ہو کر اٹھے گا۔ میں نے اُسے مزار تک پہنچا دیا۔ مجھے خان سے ہمدردی ہو چلی تھی۔ میں ہر جمعرات کو اس کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ دوسرے فقیروں سے الگ تھلگ مزار کے احاطے کے باہر سیڑھیوں کے قریب پڑا رہتا تھا جیسے اندر جانا چاہتا ہو۔

ایک جمعرات کو جب میں وہاں پہنچا تو خان نہیں تھا میں نے اُسے بہت تلاش کیا جب وہ نہیں ملا تو اس پاس موجود فقیروں سے اس کے بارے میں معلوم کیا۔ ان ہی میں سے ایک فقیر نے نہایت ہی عجیب بات بتائی۔

اس نے بتایا کہ جب میں پچھلی جمعرات کو خان سے مل کر چلا گیا تو اگلے دن جمعہ کو ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ جو عربی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے لب ولہجہ سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ عربی ہے، مزار پر پھولوں کی چادر چڑھانے آئی۔ اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ بزرگ بھی تھے جب وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے تو خان نے انہیں دیکھ لیا اور وہ "مستانی" کہہ کر چلایا۔

عربی دوشیزہ اور عمر رسیدہ بزرگ نے مڑ کر اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ خان دیوانوں کی طرح "مستانی او مستانی" کہہ کر انہیں آوازیں دیتا رہا۔ عربی دوشیزہ عمر رسیدہ بزرگ کے ہمراہ مزار کے اندر چلی گئی جیسے ان دونوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر خان پوری قوت سے اپنا جسم گھسیٹ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر حال میں مزار کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ وہ کوشش میں کئی سیڑھیاں چڑھ گیا لیکن پھر اس کے ہاتھوں نے جواب دے دیا۔ خان ہمت ہار گیا۔ وہ اوپر کی آخری سیڑھی سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور دم توڑ دیا۔ وہ پہلی سیڑھی کے پاس اس طرح سے پڑا تھا کہ جیسے مزار سے کسی نکلنے والے کو دیکھ رہا ہو۔

عربی دوشیزہ اور عمر رسیدہ بزرگ مزار سے نکلے اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر خان کے پاس پہنچے۔ ان دونوں نے گلاب کے پھولوں کی چادر اس پر ڈالی اور پھر عمر رسیدہ بزرگ نے اُسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اور جھاڑیوں کے درمیان وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے قبرستان کی طرف چلے گئے۔

وہ عربی دوشیزہ اور عمر رسیدہ بزرگ کون تھے، کہاں سے آئے تھے میں نے بہت معلوم کرنا چاہا لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا کیوں کہ انہیں پہلے کبھی کسی نے بھی مزار پر آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

اور مجھے آج بھی، کبھی کبھی، یہ خیال آتا ہے کہ کہیں مستانی اور باباجی عالم اعراف صرف خان کو لینے تو نہیں آئے تھے۔

طاہر محمود طارق عظیمی (فتح جنگ)